ان کے کئی مجموعے چھپے ہیں، یہ مجموعہ نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے، ان کا کلام نشیب و فراز کے مختلف مرحلوں سے گزرتا رہا ہے، تاہم وہ کیفیت اور تازگی سے خالی نہیں ہے یہ مجموعہ مختلف ملکوں کی سیر و سیاحت کے تجربات، زندگی کے مشاہدات اور اخلاق و حکمت کے درس پر مشتمل ہے، دیوآن صاحب مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں، اس مجموعہ میں بعض بہت مشکل زمینوں میں انھوں نے اچھے شعر نکالے ہیں، لندن میں اردو کا پرچم بلند کرنے پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں، وہاں سے ایک ضخیم مجموعہ کا اتنا خوبصورت شائع ہونا اردو کی مقبولیت کا ثبوت اور اس کا اعجاز ہے۔

**کتاب نامہ شبلی** :۔ مرتبہ جناب اختر راہی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر صفحات ۱۴۴، قیمت ۲۴ روپے، پتہ مسلم اکیڈمی، محمد نگر، علامہ اقبال روڈ، لاہور، ۵۔

یہ کتاب مولانا شبلیؒ کی تصنیفات و مقالات کے علاوہ ان پر لکھی گئی کتابوں اور مضامین کا اشاریہ ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں تین اجزا ہیں ایک میں مولانا کی مرتب کردہ اردو، فارسی اور عربی تصانیف کا ذکر ہے، دوسرے جز میں ان کے تلامذہ یا دوسرے لوگوں نے ان کی جن کتابوں اور مضامین کو شائع کیا ہے ان کی فہرست دی ہے، تیسرے میں ان کی جن کتابوں کے ترجمے دوسری زبانوں میں کئے گئے یا جن کی تلخیص کی گئی ان کا انڈکس درج ہے، دوسرے حصہ میں پہلے مولانا پر تحریر کی گئی کتب پھر ان پر لکھے جانے والے مضامین کا تذکرہ ہے، سب سے آخر میں مولانا شبلیؒ پر انگریزی کتابوں اور مضامین کی فہرست دی گئی ہے، ہر حصہ میں کتابوں کے سنہ اشاعت، ان کے صفحات کی تعداد اور مطبع کا نام بھی تحریر ہے، اور مضامین جن رسالوں یا اخباروں میں شائع ہوئے ہیں، ان کے نام ماہ و سنہ کی صراحت سے درج ہیں، اس سے پہلے مولانا شبلیؒ کے بعض اشاریے مرتب کئے گئے ہیں، جو عموماً رسالوں میں چھپے تھے، یہ اشاریہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے، اور غالباً سب سے بہتر ہے، شروع میں حافظ نذر احمد صاحب پرنسپل شبلی کالج لاہور کا ایک مختصر دیباچہ بھی ہے، جس میں مولانا شبلی کی عظمت و جامعیت بیان کی ہے، اس میں غلطی سے ایک جگہ دار المصنفین کا نام ندوۃ المصنفین لکھ گیا ہے، جو تعجب انگیز ہے۔

"ض"

---

جلد ۱۴۰　ماہ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۸۷ء　عدد ۵

## مضامین

# شذرات

گذشتہ حج کے موقع پر ایرانیوں اور سعودی حکومت کے درمیان جو خوں ریز تصادم ہوا، وہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک انتہائی افسوسناک اور غم انگیز واقعہ سمجھا جائے گا۔

اس کی المناکی پورے عالم اسلام میں محسوس کی گئی، وقت گذرنے پر اس میں کمی ہونے کی امید تھی مگر کلکتہ کے پرنس انجم قدر کے ایک گشتی مراسلہ اور اخبارات میں ان کے بیانات سے یہ پیچیدہ ہوگیا ہے، اب تک وہ بہت ہی فہیم، ذکی، صلح کل اور شیعہ سنی اتحاد کے بڑے حامی سمجھے جاتے رہے ہیں، مگر ان کی تحریروں اور بیانوں سے بظاہر یہ اثر ہوا کہ وہ بھی اس گروہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں جس سے سنی مسلمانوں کو ایذائیں پہونچا کرتی ہیں، خدا کرے یہ خیال غلط ثابت ہو، اس سانحہ پر سعودی عرب کا یہ بیان ہے کہ عین حج کے دو ایک روز پہلے ایرانیوں نے جامۂ احرام میں خنجر اور چاقو چھپا کر ایک جلوس نکالا جس میں اشتعال انگیز نعرے بلند کیے گئے، اس کے بعد جو تصادم ہوا اس میں ایک ہزار اکیاون افراد ہلاک یا زخمی ہوئے، اس بیان کو ایرانی صحیح تسلیم نہیں کرتے مگر وہ اس سے تو انکار نہیں کر سکتے کہ ان مقدس دنوں میں یہ جلوس نکالا گیا، وہ اپنے کو اسلام کا صحیح پیرو اور نمایندہ سمجھتے ہیں تو کیا ان دنوں ہر قسم کے لڑائی جھگڑے اور چھوٹی بڑی نافرمانی کی ممانعت قرآن مجید کی نص قطعی سے ثابت نہیں ہے؟ کیا انھوں نے یہ جلوس امن کے پھولوں، آشتی کے گلدستوں اور محبت کے ہاروں کے ساتھ نکالا تھا؟ اگر وہ اپنی ہر بات کو اخباروں، پمفلٹوں، تصویروں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے صحیح ثابت کرنا چاہتے ہیں تو یہ ذرائع ابلاغ آج کل کی دنیا میں اپنی چرب زبانی کی وجہ سے گمراہ کن بھی سمجھے جاتے ہیں،

ایرانیوں نے مکہ معظمہ میں جو کچھ کرنا چاہا تو ان کے ارادے، نیت اور مقصد کو شک و شبہہ کی نظر سے دیکھا نہ جاتا اگر وہ عراق کے خلاف جنگ کرنے میں وہ راج ہٹ نہ دکھاتے جو اس وقت دکھا رہے ہیں، پورے اسلامی ممالک بلکہ اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل اور جنرل اسمبلی کی خواہش ہے کہ یہ بے مقصد اور ہلاکت آفریں جنگ روک دی جائے، مگر ایران اپنی سربلندی، عزت نفس اور خودداری اسی میں تصور کر رہا ہے کہ یہ جاری رہے اور



فریقین کے ملکوں میں خون کی ندیاں بہتی رہیں، یہ تسلیم کہ عراق نے جنگ کرنے میں پہل کی اور وہ جارح ہے، لیکن جب وہ نادم، پشیمان اور صلح کا خواستگار ہے تو انتقام کے یہ ہرگز معنی نہیں کہ ایران اپنے نوجوانوں، نونہالوں اور مستقبل کی امیدوں کا گورستان بن جائے، اور عراق بچوں، عورتوں، جوانوں اور بوڑھوں کے خون سے لالہ زار ہو جائے، ملک برباد ہو جائے، مگر انتقام کی آگ کے شعلے ہر طرح گرم رہیں، کیا اسلامی انقلاب کے علمبرداروں کا یہی شیوہ ہونا چاہیے؟

کیا دشمنوں سے جنگ کرنے میں اسلام کے رسولؐ کا یہی اسوہ تھا جو ایران اس وقت پیش کر رہا ہے، کس کو نہیں معلوم ہے کہ آپؐ کے دشمنوں میں وہ بھی تھے جن کی زبانیں آپؐ پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں، وہ بھی تھے جن کی تیغ و سنان نے پیکر قدسی کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خون نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آآکر ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی آگ پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے، مگر کیا محض انتقام کی خاطر آپؐ نے ان ظالموں کے گھروں پر آگ برسائی؟ کیا ان بے رحموں کے بچوں کو تہ تیغ کیا؟ کیا ان شقی القلبوں کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی؟ کیا ان کے ساتھ وہی حسن سلوک نہیں کیا جو ایک شریف بھائی اپنے بھائی سے کرتا ہے، یا ایک شریف برادر زادہ اپنے برادر زادہ سے کرتا ہے؟ کیا آپؐ نے ان سے یہ نہیں فرمایا کہ "جاؤ تم سب آزاد ہو تم پر کچھ الزام نہیں"

ابوسفیان آپؐ کے شدید دشمن تھے، آپؐ کے خلاف جتنی لڑائیاں لڑی گئیں، ان میں سب سے نمایاں حصہ ان ہی کا تھا، فتح مکہ کے بعد حضرت عباسؓ ان کو آپؐ کی خدمت میں لائے تو حضرت عمرؓ نے ان کو قتل کر دینا چاہا، آپؐ نے منع فرمایا، رواداری اور فراخ دلی کی یہ مثال پیش کی کہ ان کے گھر کو امن و امان کا حرم بنا دیا، اور فرمایا: "جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اس کا قصور معاف ہوگا"، ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے حضرت حمزہؓ کا سینہ چاک کر کے ان کے دل و جگر کے ٹکڑے کر دیے تھے، آپ اس کو یاد کر کے بے چین اور مضطرب ہو جاتے، وہ فتح مکہ کے روز نقاب پوش ہو کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور مسلمان بن کر امان کی سند حاصل کر لی، آپؐ نے جب ہندہ کو پہچانا تو اس سے کوئی تعرض نہیں کیا، ہندہ متاثر ہو کر بول اٹھی "یا رسول اللہ! آپ کے خیمہ سے زیادہ

مبغوض خیمہ میری نگاہ میں دوسرا نہیں تھا، لیکن اب آپ کے خیمہ سے زیادہ محبوب خیمہ میری نگاہ میں دوسرا نہیں، اسی طرح ابوجہل کے فرزند عکرمہ اسلام لانے سے پہلے آپؐ کے سخت دشمن تھے، فتح مکہ کے بعد وہ بھاگ کر یمن چلے گئے، ان کی بیوی مسلمان ہوچکی تھیں وہ یمن گئیں، ان کو مسلمان بنا کر آپؐ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئیں ان کو دیکھ کر آپؐ فرط مسرت میں ان کی طرف بڑھے اور فرمایا: "اے ہجرت کرنے والے سوار تمہارا آنا مبارک ہو"

آپؐ کسی مہم پر فوج روانہ فرماتے تو سردار فوج کو جو احکام دیتے اس میں ایک لازمی حکم یہ تھا کہ کسی بوڑھے، کسی بچے یا کسی عورت کو قتل نہ کیا جائے، جنگ کے زمانہ میں یا فتح کے بعد زمینوں، فصلوں اور نسلوں کو کسی حال میں تباہ نہ کیا جائے، ایران اسلام کے احیاء و تجدید کا دعویدار ہے، وہ دنیا میں اسلام اور اسلامی انقلاب کا اپنے کو علم بردار کہتا ہے اور دنیا کے تمام مسلمانوں کو آپؐ کی تعلیم پر عمل پیرا ہوتے دیکھنا چاہتا ہے، مگر کیا بغداد اور بصرہ پر اپنے مہلک ہتھیاروں کے ذریعے آتشیں گولے برساتے وقت اسی تعلیم پر عمل کر رہا ہے جو آپؐ نے دی ہے، کیا آپؐ کا یہ ارشاد نہیں کہ مسلمان باہم رحمت، محبت اور مہربانی میں ایک بدن کی طرح ہیں، دیکھو کہ ایک عضو کو بھی درد ہوتا ہے تو تمام بدن بے خوابی اور تعب کی دعوت ایک دوسرے کو دیتا ہے، کیا ایران اس ارشاد کا قائل نہیں ہے؟

حج کے موقع پر ایران کی طرف سے مکہ معظمہ میں جو کچھ ہوا، اس کو ایران و عراق کی جنگ کے پس منظر میں بھی دیکھا جاسکتا ہے، اگر ایران کے ناقدین یہ سمجھنے پر مجبور ہوجائیں کہ وہ یہ سب کچھ اسلام کی خاطر نہیں، بلکہ اپنے مخصوص مذہبی عقائد کی تبلیغ و اشاعت کے لیے کر رہا ہے تو اس کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟ ایرانیوں کے مذہبی عقائد کی شہرت یہ ہے کہ وہ جارح، ایذا رساں بلکہ شاتم بن کر مدعے ہی میں اپنی مذہبی زندگی کی نجات کے قائل ہیں، اگر یہ شہرت صحیح نہیں اور وہ واقعی رحمۃ للعالمینؐ کے پیرو ہیں تو کیا وہ آپؐ کے اسوۂ حسنہ کے پابند ہو کر روشن کرنے والے چراغ بن کر نہیں رہ سکتے؟ کیا وہ دنیاوی زندگی میں امن پسندی، جذبۂ فدویت اور ایثار کی مثالیں نہیں پیش کرسکتے، کیونکہ یہی آپؐ کی سیرت مبارکہ کا پیام ہے، ورنہ ان کے متعلق اگر یہ رائے قائم کی جائے کہ ؎

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

تو اس کی ذمہ داری ان ہی پر ہوگی۔



# مقالات

## سیرتِ نبویؐ اور مستشرقین

## منٹگمری واٹ کے افکار کا تنقیدی جائزہ

از ڈاکٹر عماد الدین خلیل، المعہد الحضاری الموصل، عراق

ترجمہ: عبید اللہ کوٹی ندوی رفیق دار المصنفین

(۴)

اس کے بعد واٹ نے یہ نتیجہ نکالا ہے:

"شیطانی فقروں کی تنسیخ کا تعلق محمدؐ اور سردارانِ قریش کے درمیان حالات کو ہموار کرنے کی کوششوں کی ناکامی سے ہے، ہمارے لیے یہ یقین کر لینے کا کوئی جواز نہیں ہے کہ محمدؐ اہل مکہ کے فریب میں آگئے تھے، البتہ ان کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ اللہ کی ان بیٹیوں کو (تینوں مورتیاں جن کو مشرکین مکہ اللہ کی بیٹیاں سمجھتے تھے) تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کو ان کے معیار پر رکھ دیا جائے، جبکہ نخلہ، طائف اور قدید کی طرح کعبہ میں بھی پوجا ہوتی تھی، اس کے معنی یہ ہوئے کہ محمدؐ اور وہاں کے کاہنوں (پجاریوں) میں زیادہ فرق نہیں تھا، ان کے دل میں ایسا کوئی جذبہ نہیں تھا کہ وہ ان پجاریوں سے زیادہ اثر پیدا کرلیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے پوری توجہ سے جس اصلاح کے لیے کوشش کی تھی وہ وجود میں نہیں آسکی، محمدؐ نے اہل مکہ کے پیش کیے ہوئے ساز و سامان کو وقتی اسباب کے بجائے خالص مذہبی وجہوں سے

رد کر دیا تھا، اس کی وجہ مثلاً یہ نہیں تھی کہ آپ کو ان پر اعتماد نہ رہا ہو، یا آپ کی ذاتی امنگوں اور آرزوؤں کی تکمیل میں اب مزید کسی چیز کی کمی نہ رہ گئی ہو، ان کی پیش کش کو رد کر دینے کی وجہ یہ تھی کہ ان کے معبودوں کو تسلیم کر لینے سے آپؐ کی مہم ناکام ہو جاتی، اور وہ کام نہ ہو پاتا جس کی ذمہ داری آپ کو اللہ کی طرف سے سپرد کی گئی تھی، اس بارہ میں کوئی شک نہیں ہے کہ وحی نے ان کو اس بات سے آگاہ کیا تھا، مگر یہ بھی ممکن ہے کہ ان کو اسی عرصہ میں وحی کے نازل ہونے سے پہلے ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔[1]"

واٹ نے اپنی مذکورۂ بالا بحث کا خلاصہ درج ذیل لفظوں میں یہ بیان کیا ہے کہ:

"محمدؐ نے سردارانِ قریش کے مقابلہ میں اس قدر کامیابی تو یقیناً حاصل کر لی تھی کہ وہ آپؐ کی بات پر فکر مند ہو گئے تھے، چنانچہ ان کی طرف سے اس بات کی کوشش ہوئی کہ آپؐ کسی بھی صورت میں بڑی عبادت خانوں میں پوجا کو رہنے دیں، آپؐ مادی فائدوں کی وجہ سے شروع میں تو اس بات پر آمادہ تھے، آپؐ کا یہ خیال بھی تھا کہ یہ طرزِ عمل مقصد کی تکمیل میں آسانیاں فراہم کر دے گا، مگر اللہ کی طرف سے نصیحت اور تنبیہ ہونے کے بعد آپؐ کو دھیرے دھیرے یہ احساس ہو گیا کہ مذکورۂ بالا طریقہ پر باہمی مفاہمت تباہ کن ہوگی، چنانچہ انھوں نے اصل حقیقت کو قائم رکھنے کے لیے وسائل کو بہتر بنانے کا منصوبہ تیار کیا، اور تب شرک سے دست برداری کا ایسے سخت لفظوں میں اعلان کیا کہ مفاہمت اور سمجھوتے کے تمام راستے بند ہو گئے۔[2]"

دراصل یہ داستان جس کو واٹ نے امرِ واقعہ کی حیثیت دی ہے، تاریخ اسلامی میں ایک من گھڑت روایت ہے، جو مشرکین نے پھیلائی تھی، اس داستان میں جو تضاد اور انتشار پایا جاتا ہے، وہ خود اس داستان کے بے سر و پا ہونے کی نشان دہی کر رہا ہے، کتابوں میں اس کہانی کو قصۃ الغرانیق[3] بھی کہا جاتا ہے،

[1] محمد ایٹ مکہ (عربی) ص ۱۶۶ - ۱۷۲۔ [2] ایضاً ص ۱۷۶ - ۱۷۷۔



اس کہانی کا مقصد مشرکین مکہ کی طرف سے یہ ثابت کرنا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے غلطی کا امکان ہے، یا یہ کہ آپؐ غلط بات کو بھی قبول کر سکتے ہیں، اور وہ بھی اللہ کی توحید جیسے واضح اور اہم معاملہ میں جس پر آپؐ کسی مفاہمت کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے اور شرک جیسے اہم مسئلہ میں جس کو آپؐ نے قطعی انداز میں ترک کر دیا تھا، اس سے پہلے واٹ نے بھی اسی بات پر زور دیا تھا مگر چونکہ یہاں اسے نسخِ قرآن ثابت کرنا ہے، اس لیے مذکورہ بے اصل کہانی کو غلط یا مشکوک قرار دینے کے لیے وہ تیار نہیں، جب کہ اس کے پاس اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے کوئی اطمینان بخش دلیل یا قرینہ بھی موجود نہیں ہے۔

**واٹ کا اپنے طرزِ تحقیق کے بارے میں دعویٰ**

واٹ نے اپنی اس کتاب کے مقدمہ میں یہ اعلان کیا تھا کہ وہ "ارشادِ الٰہی ہے"، یا "محمدؐ نے یہ کہا ہے"، جیسے الفاظ سے احتراز کرتے ہوئے صرف اتنا کہے گا کہ "قرآن کہتا ہے"، مگر مذکورۂ بالا اقتباسات میں وہ اپنے گذشتہ دعویٰ کے برعکس ایسی تعبیرات اور الفاظ استعمال کرتا ہے جن سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم حالات کے مطابق قرآنی آیات ترتیب دے لیا کرتے تھے، مثلاً اس کی درج ذیل عبارتیں:

(۱) محمدؐ نے یہ اعلان کیا کہ ان آیات کو قرآن کا جزء تسلیم کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ اس کے برعکس مفہوم رکھنے والی دوسری آیتوں کو ان کی جگہ پڑھنا چاہیے۔

(۲) محمدؐ پر یہ لازم تھا کہ قرآن میں لات (وغیرہ) معبودوں کا ذکر کریں۔

(۳) شیطانی فقروں میں (مذکورہ) عبادت خانوں کا تذکرہ اس بات کی دلیل ہے کہ محمدؐ کے

(حاشیہ ص ۳۲۶) [3] عربی زبان میں غرانیق خوبصورت لڑکیوں کو بھی کہا جاتا ہے، چونکہ مشرکین مکہ مذکورہ تینوں مورتیوں کو خداوند کی بیٹیاں سمجھتے تھے، اس لیے ان کے بارہ میں مذکورہ کہانی بھی قصۃ الغرانیق کے نام سے مشہور ہوئی۔ (مترجم)

نقطۂ نظر میں اب وسعت پیدا ہو چلی تھی۔

واٹ کے یہ بیانات ایک دوسرے سے متصادم ہیں، اس لیے کہ فوراً ہی اس نے مذکورہ طرز عمل کی غلطی کو واضح کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ قصۃ الغرانیق والی روایت اسلام کے بنیادی موقف سے میل نہیں کھاتی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے توحید کی دعوت دینے کی ذمہ داری سپرد کی گئی تھی، ذاتی حیثیت سے بھی یہ کہانی محمدؐ کے شایانِ شان نہیں ہے، کیونکہ دیگر معبودانِ عرب کو تسلیم کر لینے کے بعد تو (واٹ کے نزدیک) محمدؐ نبوت کے امتیازی مقام سے نکل کر عرب کے ایک عام پجاری (کاہن) کی طرح ہو جاتے، مگر دعوت توحید سے واضح طور پر پسپائی اختیار کر کے واٹ یہ بھی لکھتا ہے کہ محمدؐ ان معبودوں کو تسلیم کرنے کی طرف مائل ہو گئے تھے، اور پھر یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ اس طرح ان کے نقطۂ نظر میں وسعت پیدا ہو چلی تھی، وہ استشراقی مقاصد اور تاریخی حقائق کے درمیان اعتراف و انکار میں سے کسی ایک پہلو کو اختیار کرتے ہوئے تضاد بیانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

**شیطانی فقروں کی بے اصل کہانی،**

شیطانی فقروں یا خداوندی بیٹیوں سے متعلق کہانی کو ابن سعد، طبری اور چند مفسرین نے بیان کیا ہے، مگر ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں یہ صراحت کی ہے کہ یہ تمام روایتیں اپنی سند کے اعتبار سے مرسل ہیں، ان میں درمیانی راویوں کے نام گم ہیں، کوئی ایسی روایت نہیں ہے جو صحیح سند کے ساتھ چشم دید راویوں کی نشاندہی کرتی ہو، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کم سے کم افترا پردازی اور غلط بیانی کرنے والی روایت جس میں سب سے زیادہ تفصیلات دی گئی ہیں، وہ ابن ابی حاتم کی بیان کردہ ہے، اس کی سند کا حال یہ ہے کہ اس کے راویوں کی آخری کڑی ابن شہاب ہیں، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا ان لوگوں کے ناموں کا کوئی ذکر نہیں جو مذکورہ واقعہ کے چشم دید گواہ ہوں، اس روایت میں یہ کہا گیا ہے کہ "سورۂ نجم نازل ہوئی، مشرکین یہ کہا کرتے تھے کہ یہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے معبودوں کا اچھے لفظوں میں تذکرہ کر دیں تو ہم ان کو اور



ان کے ساتھیوں کو رہنے دیں گے، وہ ہمارے معبودوں کا جس برے انداز میں ذکر کرتے ہیں، اس طرح وہ یہود و نصاریٰ کا ذکر نہیں کرتے، حالانکہ وہ بھی ان کے دین کے خلاف ہیں، سورۂ نجم نازل ہوئی تو آپ نے اس کی یہ آیت پڑھی: أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ[1] (اب ذرا بتاؤ تم نے کبھی لات اور عزیٰ اور تیسری دیوی منات کی حقیقت پر کچھ غور کیا ہے) اس موقع پر کسی شیطان نے درج ذیل الفاظ بھی پڑھ دیے: وَإِنَّهُنَّ لَهُنَّ الْغَرَانِيقُ الْعُلَىٰ وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَهِيَ الَّتِي تُرْتَجَىٰ (یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں، اور ان ہی کی سفارش قبول کی جائے گی)، اس موقع پر مشرکوں نے یہ الفاظ سنے تو انھیں یہ بات پسند آئی، اس کا ان میں چرچا ہونے لگا، اور وہ یہ سمجھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پہلے دین سے رجوع کر لیا ہے، اور ان کے دین میں شامل ہو گئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ نجم کی آخری آیت پر سجدہ کیا اور وہاں مسلم و مشرک جو بھی تھے سب نے سجدہ کیا، ہر فریق کو دوسرے کے سجدہ کرنے پر حیرت ہوئی، مسلمانوں کو مشرکین کے سجدہ کرنے پر تعجب ہوا، کیونکہ وہ ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے، مسلمانوں نے وہ الفاظ بھی نہیں سنے تھے جو شیطان کی طرف سے مشرکین کو سنائی دیے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تلاوت آیات کے درمیان جو شیطانی فقرے مشرکوں نے سنے، ان سے مشرکوں کو بڑا سکون ملا، شیطان نے ان کے جی میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ یہ الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھے ہیں، اسی لیے وہ اپنے معبودوں کی تعظیم میں سجدہ ریز ہو گئے، مگر اللہ تعالیٰ نے شیطانی فقروں کی قلعی کھول دی، واضح آیتیں نازل کر کے دجل و فریب سے قرآن کی حفاظت کا یہ کہہ کر اعلان کر دیا کہ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ الیٰ آخرہ۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن مجید میں اس امر کی مکمل وضاحت اور شیطانی فقروں کی تردید کے بعد

[1] سورۂ نجم، آیت ۱۹ - ۲۰ -

مشرکوں کی بے راہ روی، اور مسلمانوں سے عداوت میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا....

مذکورہ روایت کے مقابلہ میں کچھ دوسری روایات وہ ہیں جن میں مزید افتراپردازی کی گئی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ وہ فقرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوئے تھے، ان روایات کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش مکہ کے ساتھ مصالحت اور خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا۔

مذکورۂ بالا کہانی کی تمام ہی روایات سرے سے بے اصل ہیں، کیونکہ نبوت اور کلام الٰہی دونوں کو اللہ تعالیٰ نے دوسروں کی دست درازی اور تحریف سے محفوظ رکھا ہے، مگران روایتوں کے بے اصل ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ سورہ میں سیاق کلام ہی ایسا ہے جس کی روشنی میں مذکورہ کہانی بے جوڑ اور من گھڑت معلوم ہوتی ہے، ان آیتوں میں معبودان باطل اور بے حقیقت اوہام کے بارہ میں مشرکوں کے عقیدہ کی خرابی اور بے اعتباری کو واضح کیا گیا ہے، اس لیے ان آیتوں میں مذکورہ دونوں شیطانی فقرے کسی طرح بھی شامل نہیں کیے جاسکتے، سیاق کلام کی روشنی میں یہ روایت بھی بے جوڑ ہے کہ شیطان کی طرف سے مسلمانوں کے بجائے مشرکین کو یہ فقرے سنائی دیے تھے، ان مشرکین کے لیے بھی غلط فہمی کی گنجایش نہ تھی، وہ عرب اور اپنی زبان کے مزاج شناس تھے، مذکورہ فقروں کے فوراً بعد ہی یہ آیتیں ہیں:

| | |
|---|---|
| اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى | کیا تمھارے لیے تو بیٹے ہوں، اور اللہ |
| تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ | کے لیے بیٹیاں، یہ تو بہت بے ڈھنگی تقسیم |
| ضِيْزٰى، اِنْ هِيَ اِلَّآ | ہوئی، یہ نرے نام ہی نام ہیں جن کو تم نے |
| اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ | اور تمھارے باپ دادوں نے رکھ لیا ہے |
| اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ، مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ | اللہ تعالیٰ نے تو ان کی کوئی دلیل بھیجی نہیں، |



| | |
|---|---|
| بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ، اِنْ | یہ لوگ صرف بے اصل خیالات پر اور اپنے |
| يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا | نفس کی خواہش پر چل رہے ہیں، حالانکہ |
| تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَ | ان کے پاس ان کے رب کی جانب سے |
| هُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى، اَمْ | ہدایت آچکی ہے، کیا انسان کو اس کی ہر تمنا |
| لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى، فَلِلّٰهِ | مل جاتی ہے، دنیا و آخرت کا مالک تو اللہ |
| الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى، وَكَمْ مِّنْ | ہی ہے، اور بہت سے فرشتے آسمانوں میں |
| مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ | موجود ہیں، ان کی سفارش ذرا بھی کام نہیں |
| شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْ بَعْدِ | آسکتی جب تک کہ اللہ جس کے لیے چاہیں، |
| اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ | اجازت نہ دے دیں اور راضی ہوں، جو |
| وَيَرْضٰى، اِنَّ الَّذِيْنَ لَا | لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ |
| يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ | فرشتوں کو بیٹی کے نام سے نامزد کرتے ہیں |
| الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى وَمَا | حالانکہ ان کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں |
| لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ، اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ | صرف بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں۔ |
| اِلَّا الظَّنَّ. (نجم: ۲۱-۲۸) | ... |

مشرکین مکہ سیاق کلام کی ان آیتوں کو سن کر غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوسکتے تھے، کیونکہ اس جگہ شیطانی فقرے بے جوڑ ہیں، ان کے معبودوں کی تعریف اور خداوند کے یہاں ان کی سفارش کو قبول کیے جانے کی توقع کا ذکر بھی ان آیتوں کے درمیان شامل کیے جانے سے بات بے ربط ہوجاتی ہے، یہ مشرکین اس قدر نادان نہیں تھے جیسے وہ لوگ جنھوں نے یہ بے اصل داستان بنائی ہے اور جس کو لقمۂ تر سمجھ کر ان مستشرقین نے اپنی غرض مندی یا ناواقفیت کی وجہ سے

قبول کر لیا ہے[1]

**ابن شداد کی روایت**

واٹ نے دیانت داری، معروضیت، غیر جانبداری اور خلوص کے ساتھ سیرت نبویؐ کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے، مگر اس کے بلند بانگ دعویٰ کا انجام کیا ہوا، سیرت کے قطعی اور صحیح واقعات کو بیان کرتے ہوئے تو اس کا اسلوب بڑا ہی کمزور اور ناتواں ہو جاتا ہے مگر اپنی خام خیالی کو ثابت کرنے میں اس کے یہاں زور اور قطعیت پائی جاتی ہے، جس کی جھلک یہاں بھی موجود ہے، وہ لکھتا ہے کہ "فرشتہ کی طرف سے اِقْرَأْ (پڑھ) کہنے پر محمدؐ کے جوابی فقرہ مَا اَقْرَأُ کا یہ مطلب لینا ضروری ہے کہ میں پڑھنے پر قادر نہیں ہوں، اس مفہوم کی اس روایت سے تصدیق ہوتی ہے جس میں یہ جواب نقل کیا گیا ہے کہ مَا أَنَا بِقَارِئٍ (میں ان پڑھ ہوں) حالانکہ ابن ہشام میں مَا أَقْرَأُ (میں کیا پڑھوں) اور مَاذَا أَقْرَأُ، (میں کیا چیز پڑھوں) کے الفاظ نقل کیے گئے ہیں، مَا اَقْرَأُ کے لفظ سے بھی سادہ طریقہ سے یہی دوسرا مفہوم نکلتا ہے کہ میں کیا پڑھوں؟ مگر یقینی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے تقلیدی ذہن رکھنے والے مفسرین ان لفظوں کے سادہ مفہوم سے بچتے ہیں، تاکہ وہ اپنے اس بنیادی خیال کو قائم رکھ سکیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کتابت نہیں جانتے تھے، تفسیر طبری میں ابن شداد کی روایت ہے جس میں مَا کا لفظ مَاذَا کے معنی میں سمجھنا چاہیے، (یعنی نفی کے بجائے استفہام کے معنیٰ لیے جائیں) کیونکہ اس سے پہلے "وَ" کا حرف موجود ہے، اس روایت کو اگر درست تسلیم کر لیا جائے تو قرآن کے معجزانہ اسلوب و مزاج کا ایک نمونہ یہ آیت بھی ہے[2]

واٹ نے اس موقع پر بھی ایک شاذ روایت کا سہارا لیا ہے، حالانکہ ابن شداد کی ایک

[1] سید قطب، فی ظلال القرآن پارہ ۲۷، ص ۶۳۴ - ۶۳۶ ج ۷، طبع پنجم، دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۹۶۷ء۔

[2] محمد ایٹ مکہ، ص ۸۵ - ۸۶۔



اور روایت جو ابن جریر طبری نے مذکورہ شاذ روایت سے پہلے درج کی ہے[1] وہ بخاری شریف وغیرہ کی معروف روایتوں کے مطابق ہے، پھر واٹ نے ابن شداد کی شاذ روایت میں مَا اَقْرَأُ سے پہلے جو "وَ" ہے، اس پر اپنے خود ساختہ اصول کی مدد سے معنوی تحریف کی کوشش کی ہے، جب کہ عربی زبان و ادب میں ایسا کوئی قاعدہ موجود نہیں ہے، کہ اگر "مَا" سے پہلے "وَ" ہو تو نفی کے بجائے استفہام مراد ہوگا، مگر واٹ نے اپنے فرضی مفہوم کو بڑے اعتماد کے ساتھ پیش کیا ہے، جب کہ بخاری کی روایت نے اس لفظ کے مفہوم کو بالکل واضح کر دیا ہے، اس میں ما انا بقارئ (میں ان پڑھ ہوں) کے الفاظ موجود ہیں، اور معروف نحویوں نے یہ تصریح کی ہے کہ "مَا" کے بعد اگر حرف جر "ب" ہو تو اس سے نفی ہی کے معنی مراد ہوں گے[2]۔ اس لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا مطلب یہ ہوگا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا ہوں، البتہ یہاں ایک بات اور بھی کہی جا سکتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس لفظ کو اگر استفہام تسلیم کر لیا جائے تب بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ پڑھ بھی سکتے تھے، کیونکہ تاریخی شواہد سے اس بات کی تردید ہو جاتی ہے، اور قرآن مجید میں بھی آپ کو اُمّی کہا گیا ہے، اس لیے فرشتہ کی طرف سے اِقْرَأْ (پڑھ) کے جواب کو استفہامیہ تسلیم کرنے کے بعد بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپؐ کسی تحریر کو پڑھ بھی سکتے تھے، کیونکہ فرشتہ نے آپؐ کے سامنے کوئی تحریر پیش نہیں کی تھی، اس نے زبانی فرمائش کی تھی، اس لیے اس کے جواب میں "میں کیا پڑھوں" کا مفہوم صرف یہی ہوگا کہ فرشتہ جو الفاظ پڑھوانا چاہتا تھا وہ کیا ہیں؟ چنانچہ یہی ہوا بھی کہ فرشتہ نے جو الفاظ کہے وہ آپؐ نے اپنی زبان سے ادا کر دیے، لہٰذا استفہام کے معنی لینے کے بعد بھی واٹ کی مراد پوری نہیں ہوتی، وہ ایک ایسی بات ثابت کرنا چاہتا ہے جس کے لیے اس کے پاس کوئی بھی دلیل یا ثبوت موجود نہیں ہے[3]،

[1] تفسیر ابن جریر طبری ج ۳۰، ص ۱۳۸ مطبوعہ مصر ۱۳۰۶ھ [2] فتح الباری ج ۱، ص ۲۲ ط بولاق مصر ۱۳۰۱ھ، [3] اضافہ از مترجم۔

دورِ جاہلیت میں بعض مشرکین مکہ کو یہ وہم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب سے حصولِ علم کیا ہے، یا کم از کم یہ بات ضرور ہے کہ آپؐ نے اپنی تعلیمات میں ان کا اثر قبول کیا ہے، اور ان سے استفادہ کیا ہے، مگر مشرکین مکہ نے اس خیال کو کبھی اہمیت نہیں دی، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ان کے سامنے تھی، اور اہل کتاب سے استفادہ کو وہ بے اصل بات سمجھتے تھے، مگر واٹ نے اپنے خاص انداز میں یہی بات اس طرح لکھی ہے جیسے کہ وہ کوئی ثابت شدہ واقعہ ہو، وہ لکھتا ہے کہ:

"اس بارہ میں کوئی شک نہیں ہے کہ ورقہ بن نوفل سے (جو آخر عمر میں عیسائی ہو گئے تھے) خدیجہؓ متاثر تھیں، اور ہو سکتا ہے کہ محمدؐ نے ورقہ کے جذبات و خیالات کو قبول کر لیا ہو[1]"

ورقہ کی طرف سے حوصلہ افزائی ایک اہم واقعہ ہے، ناموس کے لفظ کے ساتھ جو فقرہ نقل ہوا ہے، اس کی صحت کے بارہ میں بھی کسی شبہہ کی گنجائش نہیں ہے، قرآنی لفظ توراۃ کے بجائے اس لفظ کا نقل کیا جانا روایت کے صحیح ہونے کا ثبوت ہے... ورقہ بن نوفل سے محمدؐ کی ملاقات کا ذکر جس روایت میں کیا گیا ہے وہ اس روایت سے زیادہ بہتر ہے جس میں دونوں کی ملاقات کا ذکر نہیں ہے... ناموس کا لفظ یونانی زبان کے لفظ (Nomos) سے بنا ہے، اس لیے اس سے شریعت یا کتب مقدسہ (بائبل) مراد ہیں، روایت میں موسیٰؑ کے تذکرہ سے یہ بات پوری طرح میل کھاتی ہے، محمدؐ وحی حاصل کرنے لگے تو ورقہ نے جو رائے دی ہے، اس کا یہی مفہوم ہے کہ محمدؐ پر یہود و نصاریٰ کی کتب مقدسہ کی طرح کی چیز نازل ہوئی تھی، محمدؐ نے جو کچھ سنا تھا اس کی وجہ سے انھیں یہ خیال ہوا کہ وہ ایک نئی امت کے بانی اور صاحب شریعت ہیں، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ وہ اپنے مزاج و طبیعت کی وجہ سے (؟) تذبذب کا شکار رہتے تھے، اس لیے اس سے پہلے کہ وہ اپنے تجربات کی

---

[1] محمد ایٹ مکہ (عربی ترجمہ) ص ۷۵۔



روشنی میں کوئی بڑا تعمیری قدم اٹھاتے، ورقہ کی طرف سے ان کی حوصلہ افزائی کو ان کے اندرونی انقلاب میں بڑی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے[1]۔

**گذشتہ مذہبی کتابیں اور قرآن مجید**

دورِ جاہلیت میں جس طرح وحی کو سمجھنے سے کچھ لوگ قاصر رہے، اسی طرح واٹ بھی حقیقتِ وحی سے بے خبر ہو کر مختلف باتیں فرض کرتا چلا جاتا ہے، وہ یہ تو کہتا ہے کہ اگر ہم یہ فرض کر لیں تو بہتر ہوگا کہ محمدؐ نے بہت پہلے سے ورقہ سے تعلقات استوار کر لیے تھے[2] اور پھر وہ اپنے اس مفروضہ پر کوئی دلیل بھی پیش نہیں کرتا، واقعہ یہ ہے کہ وہ ایسا کر بھی نہیں سکتا، اس لیے کہ کسی بھی تاریخی روایت یا دلیل سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امی نہیں تھے دورِ جاہلیت کے متعلق بیان کرتے ہوئے بھی واٹ جانبدارانہ تعصب میں مبتلا ہو گیا ہے، وہ تاریخی شواہد پیش کرنے کے بجائے پہلے چند مفروضات قائم کرتا ہے اور ان ہی پر اپنی عمارت تعمیر کرتا چلا جاتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امی ہونے پر قرآن مجید نے جو واضح اور قطعی انداز بیان اختیار کیا ہے اس کے خلاف مشرکین مکہ کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکے، اس لیے قرآن ہی کا فیصلہ وہ واضح اور یقینی ثبوت ہے جو اس مسئلہ کو آخری طور پر حل کر دیتا ہے کہ آپؐ نے کس سے استفادہ کیا، اور آپؐ کا ذریعۂ معلومات کیا تھا، قرآن مجید میں یہ کہا گیا ہے کہ:

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ — ہمیں معلوم ہے یہ لوگ تمھارے متعلق
اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ، لِسَانُ — کہتے ہیں کہ اس شخص کو کوئی آدمی سکھاتا
الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ — پڑھاتا ہے، حالانکہ ان کا اشارہ جس
اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ — آدمی کی طرف ہے، اس کی زبان عجمی ہے
مُّبِيْنٌ. (نحل: ۱۰۳) — اور یہ صاف عربی زبان ہے۔

---

[1] محمد ایٹ مکہ ص ۵۰، [2] ایضاً ص ۹۳۔

قرآن مجید اور گذشتہ مذہبی کتابوں میں اگر کہیں کہیں کچھ مسائل کے حل کے سلسلہ میں یکسانیت پائی جاتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حل ایک ہی سرچشمہ یعنی ذات الٰہی سے مستفاد ہے، تورات و انجیل کے ذریعہ جس تعمیری کام کا آغاز ہوا تھا، اس کی تکمیل کے لیے قرآن مجید نازل کیا گیا ہے:

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (یونس: ۳۷)

اور یہ قرآن وہ چیز نہیں ہے جو اللہ کی وحی و تعلیم کے بغیر تصنیف کر لیا جائے، بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آ چکا تھا اس کی تصدیق اور الکتاب کی تفصیل ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رب کائنات کی طرف سے ہے۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ.... (انعام: ۹۲)[1]

یہ ایک کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے، بڑی خیر و برکت والی ہے، اس چیز کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے آئی تھی....

اس جگہ یہ بات بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ قرآن مجید کی بے شمار آیتوں نے تورات و انجیل میں تحریفات کی صراحت کی ہے، بہت سی جگہ ان کے برعکس دوسرے احکام و واقعات دیے ہیں، یا تورات و انجیل کے بہت سے بیانات کی تردید کی ہے، کئی ایسی حقیقتوں کا انکشاف کیا ہے جن کو تورات و انجیل نے سرے سے نظر انداز کر دیا تھا۔

۱؎ مزید دیکھیے سورہ بقرہ: ۴۱، ۸۹، ۹۱، ۹۷، ۱۰۱۔ آل عمران: ۳، ۳۰، ۸۱۔ یوسف: ۱۱۱۔ احقاف: ۱۲، ۳۰۔ نساء: ۴۷۔ مائدہ: ۴۶، ۴۸۔ فاطر: ۳۱۔



واٹ نے سیرت نبوی میں اپنے خیالات کی آمیزش اس طرح کی ہے کہ (پہلی نظر میں) مطالعہ کرنے والا اس سے بے خبر رہتا ہے، وہ اپنی تحریروں میں جذباتی انداز کے بجائے دقیقہ سنجی، تدبر، اور گہرائی پیدا کرنے کے لیے چونکا دینے والا انداز بیان اختیار کرتا ہے، ممکن ہے کہ اس نے ایسا عمداً نہ کیا ہو، مگر اس کا انداز بیان ایسا ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ سیرت نبوی کے دور رس اثرات اور امتیازی اوصاف کو مسلمانوں اور غیر مسلموں کی نظروں میں کم کرنے کی کوشش کر رہا ہے، اس کے طرز بیان کے متعدد نمونے اس سے پہلے پیش کیے جا چکے ہیں، مثلاً مشرکین مکہ کی طرف سے مسلمانوں پر دباؤ کو کمتر ثابت کرنا، یا ہجرت حبشہ کا سبب کچھ اور ہی قرار دینا، یا مکہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں منصوبۂ قتل سے انکار، یا مسلمانوں کے درمیان مکہ مکرمہ ہی میں دو گروہوں کو ثابت کرنے کی کوشش، یا واٹ کی طرف سے اس بات پر اصرار کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں دعوت توحید کو ترک کرنے اور مشرکانہ طور طریق اختیار کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے، یہ تمام باتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ واٹ سیرت نبوی کو اس کے اصلی رنگ میں پیش کرنے کے بجائے اپنے محدود تصورات اور فرضی خیالات کو پیش کرنے سے زیادہ دلچسپی رکھتا ہے، گذشتہ صفحات میں مستشرقین پر واٹ کا تبصرہ گذر چکا ہے، لامانس پر اس نے بڑی سخت تنقید کی ہے، اور یہ تک لکھ دیا ہے کہ:

"لامانس کا یہ شرارت انگیز فرضی خیال ہے کہ مکہ کی طاقت و قوت حبشی غلاموں کی ایک فوج کے بل بوتہ پر قائم تھی، حالانکہ یہ خیال بے بنیاد ہے۔"[1]

ٹیوڈر نولدیکی نے لامانس کے مطالعہ پر اپنے خیالات پیش کیے تو اس پر واٹ نے یہ رائے دی کہ:

۱؎ محمد ایٹ مکہ (عربی ترجمہ) ص ۹۳۔

"اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ اس کتاب سے غلو پسند لامانس کے بہت سے خیالات میں ترمیم
کرلی جائے۔[1]"

واٹ نے کائتانی پر بھی تنقید کی ہے، اور پھر تحقیق کے تعمیری انداز بحث پر اظہار خیال
کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"یہ بات یقینی ہے کہ جو کتابیں ہمیں دستیاب ہوئی ہیں، ان کے مصنفین کے پاس تاریخ
کا صحت مند ذخیرہ موجود تھا، جس کو انھوں نے اپنی کتابوں میں ذہانت کے ساتھ استعمال
کیا ہے۔[2]"

**واٹ کے دو رخ** سیرت کے مباحث پر واٹ نے قلم اٹھایا تو وہ مستشرقین پر اپنے اعتراضات کو
بھول گیا، اور ان ہی کی ڈگر پر چل پڑا، وہ سیرت طیبہ کے مکی دور کے بارہ میں ہر ایک تاریخی روایت
کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے، ان کا انکار کرتا یا ان میں شک پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور ان کو
بیان کرتے ہوئے درمیان میں اپنے فرضی خیالات بھی شامل کر دیتا ہے، وہ اگر کسی روایت کو
صحیح قرار دیتا ہے تو اس میں گومگو کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے، مثلاً اس کے درج ذیل فقرے:

"یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے، اگرچہ اسے بعد کے افکار سے ہم آہنگ بنانے کے لیے ہی (تاریخ
میں) درج کیا گیا ہو۔[3]"

"اگر ہم ان روایات کو صحیح تسلیم کرلیں تب بھی ....[4]"

"قریش کے لیڈروں کی طرف سے پیش کش کی داستانیں اگر صحیح ہیں تو ....[5]"

"ایسی صورت میں یہ ہو سکتا ہے کہ ہم تقلیدی روایتوں کی بیان کردہ نمایاں باتوں کو قبول کرلیں۔[6]"

---

۱ محمد ایٹ مکہ (مقدمہ) ص ۹-۱۰، ۲ ایضاً ص ۲۱۳، ۳ ایضاً ص ۱۶۳، ۴ ایضاً ۵ ایضاً
ص ۱۷۷، ۶ ایضاً ص ۲۳۲۔



"ان میں صحت کی علامتیں پائی جاتی ہیں۔[1]"

اسی طرح واٹ "غالباً یہ ہے"، "ہو سکتا ہے"، "ممکن ہے کہ"، جیسے الفاظ سے اپنے خیالات پیش
کرتا ہے، اور پھر بعد میں انھیں تسلیم شدہ حقائق کی طرح منوانے کی کوشش کرتا ہے، واٹ کے تحقیقی
انداز بحث کا یہ مثبت پہلو ہے، منفی پہلو کے لحاظ سے اس نے اگرچہ لامانس کی طرح سیرت طیبہ کے
مکی دور کے تمام واقعات کو بعید از قیاس قرار نہیں دیا ہے، تاہم وہ اس دور میں سیرت نبوی کے
مختلف اثرات اور کئی خصوصیات کا انکار کرتا ہے، ایک مورخ اپنے ظن و قیاس کے بل پر کسی دلیل
و ثبوت کے بغیر اگر چند واقعات کا انکار کرتا ہے تو وہ اس طرح پوری تاریخ ہی کو خلاف واقعہ
ثابت کر سکتا ہے، اگر وہ تحقیق و بحث کے اصول کا پابند نہیں ہے تو وہ تسلیم و انکار دونوں صورتوں
میں کہیں بھی رک سکتا ہے، اور کسی بھی سمت میں جا سکتا ہے۔

اس موقع پر ہمارا مقصد یہ ثابت کرنا نہیں ہے کہ ایک مسلمان مورخ کو ہر ایک تاریخی روایت
کے سامنے سرنگوں ہو جانا چاہیے، یا اسے روایتوں میں نقد و تجزیہ اور قیاس و تخیل سے ہر حال میں
احتراز کرنا چاہیے، ہمارا مقصد یہ ہے کہ بحث و تحقیق کرتے ہوئے ہر ایک چیز کے بارہ میں شک میں
مبتلا ہو جانا اور تنقیدی رجحان میں غلو سے کام لینا تاریخی صداقتوں سے روگردانی کا سبب بھی بن سکتا
ہے، تاریخ کا مطالعہ یا تاریخی صداقتوں کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ہم تاریخ کو
اس کی حقیقی صورت میں دیکھ لیں، اس بارہ میں کسی مورخ کے پابند نہ ہوں،[2] تاریخی روایتوں کو پرکھنا
ضروری ہے، اس سلسلہ میں محدثین نے ہمارے لیے قابل قدر نمونہ پیش کیا ہے، اس راہ میں
ہمیں ابن خلدون جیسے صاحب نظر مورخ کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جس نے گذشتہ دور کے

---

۱ محمد ایٹ مکہ (مقدمہ) ص ۱۶۶ ۲ تاریخی روایات کے بارے میں معتدل تنقیدی انداز تحقیق پر دیکھیے
مولف (عماد الدین خلیل) کی کتابیں "فصول فی المنہج والتحلیل" اور "حول منہج التاریخ الاسلامی"۔

کئی مورخوں پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ وہ ہر ایک روایت کو قبول کر لیتے ہیں۔ ان روایتوں کو بھی جو کسی طرح قابل قبول نہیں۔

اس لیے تاریخ کی کتابوں میں درج ہر ایک بات کو قبول کر لینا غلط ہے، مگر پوری تاریخ ہی پر شک کرنا اور ہر تاریخی روایت کو نظر انداز کر دینا بھی درست نہیں ہے، دونوں صورتوں میں ہم تاریخی صداقتوں سے محروم ہو جائیں گے، اور تاریخ کے بنیادی سرمایہ کو گم کر دیں گے۔

**سیرت طیبہ کو سمجھنے کے لیے اس زمانہ کا مطالعہ ضروری ہے**

ایک اور بات جو سب ہی مستشرقین میں پائی جاتی ہے یہ ہے کہ وہ سیرت طیبہ کے واقعات کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے اس زمانہ کے عربی ماحول سے تو صرف نظر کر لیتے ہیں، اور پھر خود اپنے ہی زمانہ کے آئینے میں، اپنے ہی رسوم و قیود سے بندھے ہوئے ماحول میں ان واقعات کو سمجھنے اور اپنے خیالات کا ان پر عکس ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں، مغربی محققین نے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کام کیا ہے، ان میں تحقیق کی یہ خامی ہر جگہ موجود ہے۔

ان تحقیقات میں مغرب کی ذہنی پیچیدگیاں اور ان کی تہ میں مذہبی جذبات ایک ساتھ کارفرما ہیں، مزید برآں سیکولر رجحانات، مادہ پرست زندگی کے اصول، ان کا مصنوعی نقطۂ نظر، اور ہر چیز کو اسی کی روشنی میں جانچنے کی خواہش، روحانی اور غیبی امور میں بھی اسی نقطۂ نظر کی عکاسی اور یہ خیال کہ تجربہ اور نظر میں نہ آنے والی ہر چیز بے اصل اور وہم ہے، یہ باتیں استشراقی تحقیقات میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔

سماجی علوم اور خصوصاً تاریخ انسانی کے بارہ میں اہل مغرب احساس برتری میں مبتلا ہیں، وہ اپنی عظمت کے نشہ میں چور ہو کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ایک مسئلہ کو سمجھنے اور ہر گتھی کو سلجھانے پر انہیں قدرت حاصل ہے، مستشرقین کی تحقیقات میں ان کے یہ احساسات و جذبات پہلو بہ پہلو



نظر آتے ہیں۔

زمان و مکان کے فرق کی وجہ سے ایک ہی بات کے اثرات یا اس کے بارے میں سوچنے کا انداز مختلف ہو جاتا ہے، کسی بات پر ایک ماحول میں لوگ چونک پڑتے ہیں، لیکن دوسرے ماحول میں عرف و رواج کے مطابق ہونے کی وجہ سے اس پر کوئی رد عمل نہیں ہوتا، ایک واقعہ جو کبھی حالات کے تقاضے کے مطابق نظر آ رہا تھا، اگر حالات بدل جائیں تو اب وہ بے موقع اور بے محل معلوم ہوگا، بیسویں صدی میں کسی حادثہ پر کسی خاص ماحول میں عمل اور رد عمل کا جو سلسلہ نظر آئے گا، ضروری نہیں کہ اسی پیمانہ پر ہر زمانہ میں اور ہر ایک ماحول میں لازمی طور پر وہی رد عمل پیدا ہو، مگر یہ مستشرقین سیرت نبویؐ کا مطالعہ کرتے ہوئے تاریخ کی کتابوں میں اسی رد عمل کی تلاش و جستجو میں مصروف نظر آتے ہیں، جو مغرب میں ان کے اپنے ماحول میں ظاہر ہو سکتا تھا، اہل مغرب اپنے رد عمل کو عربوں کی تاریخ میں تلاش کرتے ہیں، اور اگر اس کی ہلکی سی جھلک بھی نظر آ جائے تو اسی کے اندر وہ پوری تاریخ کو گردش دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

**واٹ کا تضاد**

واٹ نے سیرت کا مطالعہ کرتے ہوئے اگرچہ تاریخ کے مادی نقطۂ نظر کو رد کر دینے کا دعویٰ کیا ہے، مگر وہ کبھی شعوری طور پر اور کبھی غیر شعوری طور پر اسی راہ پر گامزن ہے جو راہ دوسرے مستشرقین نے اختیار کی ہے۔

اس کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ فرقہ وارانہ جذبات سے علیٰحدہ ہو کر خالص معروضی طریقہ پر بحث و تحقیق میں حصہ لے گا، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "میں نے ان نقطی مسائل میں جو مسیحیت اور اسلام کے درمیان چھڑ گئے ہیں، ایک غیر جانبدارانہ موقف اختیار کرنے کی کوشش کی ہے، اسی طرح یہ جاننے کے لیے کہ قرآن کلام اللہ ہے یا کلام رسول نہیں ہے، میں نے ہر بار قرآن سے دلیل پیش کرتے ہوئے "ارشاد الٰہی ہے" یا "محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں" کے الفاظ سے احتراز کیا ہے، میں سادہ طور پر

صرف اتنا کہوں گا کہ "قرآن کہتا ہے"، لیکن مورخ کی غیر جانبداری کو برقرار رکھنے کے لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ مادی نقطۂ نظر کو اختیار کرنا بھی میرے لیے کوئی لازمی شرط نہیں ہے، اس کے برعکس میں ایک صلح پسند اور توحید پر ایمان رکھنے والے شخص کی طرح اظہار خیال کروں گا۔[1] (اس کے بعد واٹ نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ) "میرا یہ تحقیقی کام یقیناً ایک پہلو سے ناقص رہے گا، کیونکہ اسلام کے ساتھ مسیحیت کے جو روابط ہیں ان میں عیسائیوں پر ایک فرض یہ بھی عائد ہوتا ہے کہ محمدؐ کے بارہ میں وہ اپنے رویہ کو متعین کریں، اس رویہ کو فقہی مسائل کی روشنی میں طے کرنا ہوگا، لہٰذا اس پہلو سے میری کتاب میں جو کمی رہ جاتی ہے اس کا مجھے اعتراف ہے، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اس کتاب میں تاریخ کا وہ ضروری حصہ یکجا کر دیا گیا ہے جس کی روشنی میں عیسائیوں کے لیے (محمدؐ کے بارہ میں) فقہی اور قانونی رویہ متعین کرنے میں مدد ملے گی۔[2]"

مذکورۂ بالا یقین دہانی کے بعد واٹ نے اپنے مسلمان مطالعہ کرنے والوں کو یہ اطمینان دلایا ہے کہ:

"مغرب میں تاریخ کے جن اصولوں پر اعتماد کیا جاتا ہے ان کی صحت اور افادیت کے حق میں مخلص ہونے کے باوجود میں نے اس پابندی کو قبول کر لیا ہے کہ امکانی حد تک کوئی ایسی بات نہیں کہوں گا جو اسلام کے بنیادی عقیدوں سے متصادم ہو، اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مغرب کے علم اور اسلامی عقیدہ کے درمیان بڑا تفاوت ہے، اگر مغربی علماء کے کچھ خیالات مسلمانوں کے لیے ناقابل فہم ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کے یہ اہل علم اپنے علمی اصولوں کے حق میں ہمیشہ مخلص نہیں رہے، دقیقہ رس تاریخی زاویہ سے ان کے خیالات پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔[3]"

---

۱۔ محمد ایٹ مکہ (عربی ترجمہ) مقدمہ ص ۵ ۲۔ ایضاً ۳۔ ایضاً ص ۶۔



مستشرقین کے بارہ میں واٹ کی مذکورۂ بالا رائے قابل قدر ہے، مختلف ملکوں میں مستشرقین کی طرف سے اسلام کے خلاف کتابوں کا ایک انبار لگ گیا ہے، مگر ان میں واٹ کے نزدیک بنیادی تحقیق کے علمی اصول وضوابط کے بجائے غلطی کا سرچشمہ یہ ہے کہ ان اصولوں کو اپنے مقصد کے لیے صحیح ڈھنگ سے استعمال نہیں کیا گیا۔

مذکورہ اعتراف کے باوجود واٹ مغربی ماحول کے دیگر اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکا ہے، وہ اپنی کتاب کے مقدمہ میں تو غیر جانب داری کا مدعی ہے، مگر چند ہی سطروں کے بعد مکی دور کی تاریخ کے ایک اہم ماخذ کی حیثیت سے وہ قرآن مجید کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے رویہ میں دو باتیں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں، وہ قرآن مجید کے تاریخی بیانات کے برمحل ہونے سے مطمئن نہیں ہے اور قرآن مجید نے جو نتائج اخذ کیے ہیں، واٹ ان کے ارد گرد شبہات پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ مقدمۂ کتاب ہی میں لکھتا ہے کہ:

"کسی وقت یہ رسمی خیال تھا کہ مکی دور کو سمجھنے کے لیے قرآن ایک اہم ماخذ ہے، اس مدت کے لیے قرآن ایک معاصر ضرور ہے، مگر جانبدارانہ حیثیت سے اس کے مختلف اجزاء کے درمیان ایک تو زمانی تسلسل کو قائم رکھنا دشوار ہے، اور اس کوشش سے جو نتائج برآمد ہوں گے، ان کے ارد گرد شک منڈلاتا ہوگا، قرآن مکی دور میں محمدؐ یا مسلمانوں کی زندگی کا مکمل خاکہ پیش کرنے میں ہمارے لیے کسی طرح بھی معاون نہیں ہے، مکی دور کی نمایاں باتوں کے متعلق سیرت میں جو خاکہ پیش کیا گیا ہے مغرب کے سیرت نگاروں نے صرف اسے ہی تسلیم کیا ہے، اور اس کے دائرہ میں رنگ بھرنے کے لیے قرآنی بیانات کے زیادہ سے زیادہ ممکن حصے سے انھوں نے استفادہ کیا ہے، بہتر راستہ یہ ہے کہ قرآن اور ابتدائی حدیثوں کو ماخذ کی حیثیت دی جائے، جس سے مذکورہ مدت کی تاریخ کو سمجھنے میں یہ دونوں مشترک طور پر ایک دوسرے کے خلاء کو پر کریں،

قرآن نے ہمیں یکجا طریقہ سے ان تبدیلیوں کے فکری پہلو سے باخبر کیا ہے جو مکہ اور اس کے اطراف میں رونما ہوئیں، لیکن ایک موزوں خاکہ بنانے اور خود فکری پہلو کو بھی اچھی طرح سے سمجھنے کے لیے سیاسی، سماجی، اور اقتصادی پہلوؤں کو اہمیت دینا ضروری ہے[1]۔"

قرآن مجید کو جانب دار قرار دینا، اس کے بیانات کو بے محل بتانا اور اس کے ذکر کردہ تاریخی نتائج کی صداقت میں شک کرنا، واٹ جیسے مستشرق کا کام ہو سکتا ہے، ہم اس پر یہ فرض تو عائد نہیں کر سکتے کہ وہ قرآن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ کتاب تسلیم کرے، مگر ہم مسلمانوں کی طرف سے واٹ کے اس انداز کے تبصروں کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے، قرآن مجید کو ایک تاریخی ماخذ تسلیم کر لیا جائے تب بھی قرآن مجید کے بے محل بیانات یا اس کے مشکوک نتائج پر واٹ نے کوئی ایک دلیل بھی نہیں دی، اس کی کتاب اول سے آخر تک ایسی کسی مثال یا دلیل سے خالی ہے۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے، اس لیے وہ ہر شک و ریب سے بالاتر ہے، اس کی کلامی اور معنوی خوبیوں کا اعتراف کیا گیا ہے، اور وہ اپنی اعجاز بیانی میں بے مثل ہے، عہدنامۂ قدیم و جدید جس کے مجموعہ کو کتاب مقدس اور بائبل کہا جاتا ہے وہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے زمانوں کے بعد مختلف موقعوں پر مرتب ہوا ہے، ان کی طرح قرآن مجید کا یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ لمحہ بہ لمحہ تاریخی تفصیلات اور روزانہ کے جزئی واقعات کو ایک تاریخ کی کتاب کی طرح تفصیل سے بیان کرے، لیکن اس کے باوجود کئی محققین نے قرآن مجید سے مکی اور مدنی دور کے بارے میں قابل قدر تاریخی حقائق مستنبط کیے ہیں، انھوں نے تاریخی انداز رکھنے والی آیتوں کو یکجا کر کے سیرت نبویؐ کا ایک خاکہ ترتیب دیا ہے، یہ کتابیں دقیقہ سنجی اور نکتہ رسی کا اعلیٰ نمونہ ہیں، چنانچہ دروزہ کی کتاب "سیرۃ الرسولؐ؛ صور مقتبسۃ من القرآن الکریم" صالح احمد العلی کی "محاضرات فی تاریخ العرب" اور سید قطب کی کتاب

[1] محمد ایٹ مکہ، ص ۱۲-۱۳۔



فی ظلال القرآن میں مختلف سورتوں (انفال، آل عمران، احزاب، توبہ، محمدؐ، الفتح وغیرہ) کی تفسیریں اگر ہم مثال کے طور پر پڑھیں تو ہم کو یہ اچھی طرح اندازہ ہو جائے گا کہ قرآن مجید میں سے سیرت رسولؐ پر کس قدر اہم معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

قرآن مجید ایک عقیدہ کی کتاب اور ایک عظیم تحریک کا لائحۂ عمل ہے، اس کے بیانات میں تاریخی واقعات کے کسی پہلو سے اگر گفتگو کی گئی ہے تو اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ کسی زمانہ کے تمام واقعات و حالات کا مرتب اور مکمل خاکہ پیش کر دیا جائے، ان واقعات کو بیان کر کے ان پر تبصرہ کا مقصد یہ ہے کہ ایک فرماں بردار انسان یا اطاعت گذار جماعت اس کی روشنی میں اپنا طرز عمل درست کر سکے، قرآن تاریخی واقعہ سے تربیت کا کام لیتا ہے، اور ان موقعوں پر قرآن مجید کا اسلوب اپنی طاقت اور تاثیر میں نہایت ہی عظیم اور بلند ہو جاتا ہے، واقعات سے قرآن مجید کا استدلال کا یہ طریقہ امت اسلامیہ میں تحریکی ذہن اور متحرک اور فعال زندگی کی نشو و نما کرتا ہے، امت اسلامیہ خلاء میں رہنے والے نظریات یا بے نتیجہ لاہوتی مناظروں سے پیدا ہونے والے خیالات پر انحصار کرنے کے بجائے زندگی کے واقعات سے سبق حاصل کرتی ہے، زندگی کے واقعات سے استدلال کا یہ طریقہ قرآن مجید کا ایک نمایاں اور منفرد اسلوب ہے۔

**تضاد کی ایک اور مثال** واٹ نے مکہ مکرمہ کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کو بیان کرنے کے لیے قرآن مجید کے ساتھ دور اول کی احادیث نبویؐ پر اعتماد کو ضروری قرار دیا ہے، تاکہ مکی دور کو سمجھنے کیلیے قرآنی رہنمائی کی تکمیل کی جا سکے، وہ قرآن کے ساتھ حدیثوں کو بھی تاریخ کا اہم ماخذ سمجھتا ہے مگر تھوڑی ہی دیر بعد وہ اس کے برعکس دوسری بات کہنے لگتا ہے، دلیل و ثبوت کے طور پر احادیث کو قبول کرنے میں اپنے شک کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"غالباً اکثر موقعوں پر یہ احساس ہوگا کہ میں نے عملاً احادیث سے ان لوگوں کے مقابلہ میں کم ہی

تعلق رکھا ہے، جن کو حدیثوں پر مجھ سے زیادہ شک ہے۔"[1]

حالانکہ واٹ نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں حدیث پر زیادہ معتدل طرزِ عمل کا یقین دلاتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ:

"جب میں محمدؐ کی زندگی کے پس منظر اور اس کے مکی دور پر بحث و جستجو میں مصروف تھا تو میں اس خیال کی روشنی میں آگے بڑھا کہ احادیث کو عمومی حیثیت سے قبول کر کے انھیں احتیاط کے ساتھ لینا چاہیے، خود غرضانہ اضافہ کے پائے جانے کی وجہ سے جن امور میں ہمیں شک ہے ان میں امکانی حد تک تصحیح کی کوشش کرنی چاہیے، البتہ یہ ضروری ہے کہ اگر حدیثوں میں داخلی طور پر تناقض پایا جائے تو ہم انھیں بالکل ہی نظر انداز کر دیں۔"[2]

**تدریجی ارتقاء کا نظریہ** | واٹ نے تمام مغربی اسکالرس کی تقلید میں مذاہب کے تدریجی ارتقاء کے جدید مغربی نظریہ کو قبول کر لیا ہے، یعنی تاریخ کے ہر ایک دور میں نبی یا رسول نے اس وقت کے تقاضوں کے مطابق عمل درآمد کیا، اس لیے مذہب کے بارے میں واٹ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مذہب اپنے ہی زمانہ کے تقاضوں کی پیداوار ہوتا ہے، وہ ایک نبی کی حیثیت سے اس کی کارکردگی کی وسعتوں کو اور ایمان و عقیدہ کے آخری نقوش کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہے، حالانکہ نبی کی آمد ایک عقیدہ و ایمان کی تلقین کے لیے ہوتی ہے، مثلاً واٹ کے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دور میں اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ دعوتِ اسلامی کی نوعیت عالمی ہے، بلکہ ان کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ پیغام تمام عربوں کے لیے ہے، وہ وقتاً فوقتاً جیسے جیسے تاریخی حالات سے گذرتے گئے ان کی دعوت کے حدود میں توسیع اور اس کے پیغام میں عمومیت اور وسعت پیدا ہوتی چلی گئی۔

دین کا مذکورہ مصنوعی اور غلط مفہوم ایک ایسی مکمل پارٹی کا تصور ہے جو ابتداء میں چند مقاصد

---

[1] محمد ایٹ مکہ (مقدمہ) ص ۱۳ [2] ایضاً ص ۱۱-۱۲۔



کے لیے بنی ہو، مگر یہ مفہوم مذاہب کی تاریخ میں اس بڑی حقیقت کو اچھی طرح نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر ایک دین پہلے ہی مرحلہ میں یکبارگی نازل نہیں ہوا، اور یہ بھی نہیں ہوا کہ پہلی بار ہی اس کے عقیدت مندوں کو تمام فرائض اور ممنوعات کی پابندی کا حکم دے دیا گیا ہو، دین تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا ہے اور تدریجی طور پر کم و بیش مدت کے بعد پایۂ تکمیل کو پہونچتا ہے، اپنے نزول کی اس مدت میں منزل بہ منزل وہ تاریخی کروٹیں لیتا ہوا اثر انداز ہوتا چلا جاتا ہے، اس دوران میں ذہنی رشتوں کو استوار کرنے کی اور افہام و تفہیم کے مرحلوں سے گذرنے کی ضرورت پڑتی ہے وہ متحرک ہو کر ایمان و عقیدہ کی تخم ریزی کرتا ہے جس سے مثبت نتائج برآمد ہوں، نئی مذہبی اور اخلاقی قدریں وجود میں آئیں اور فکر و خیال میں نئی تبدیلیاں ہوں، ظاہر ہے کہ پورے دین کے اچانک آجانے کی صورت میں یہ مقاصد پورے نہیں ہو سکتے، اسی وجہ سے قرآن مجید بھی مرحلہ وار نازل ہوا ہے، اس میں واضح طور پر یہ بات کہہ دی گئی ہے کہ:

| | |
|---|---|
| وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا۔ | اور قرآن میں ہم نے جا بجا فصل رکھا، تاکہ آپ اس کو لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں اور ہم نے اس کو تدریجاً (تھوڑا تھوڑا) ہی نازل کیا ہے۔ |
| (بنی اسرائیل: ۱۰۶) | |

قرآن مجید کا نزول مختلف مرحلوں میں ہوتا رہا، اس عرصہ میں قدم بہ قدم اور خشت در خشت اطاعت گذار فرد اور جماعت کی تشکیل ہوتی رہی، تاکہ تشکیل کا کام پورا ہونے کے ساتھ ہی اسلامی تعلیمات اور اسلامی تاریخ دونوں کی فطری رفتار برقرار رہے، اور قرآن مجید زندگی کی چلتی پھرتی تصویر بن کر اپنے نصب العین کو نگاہوں کے سامنے کھڑا کر دے، اس نے اپنی تعلیم و تبلیغ کے لیے فلسفیانہ اور الٰہیاتی بحثوں کا طومار نہیں باندھا۔

یہ بات درست نہیں ہے کہ انبیاء کرامؑ اپنی راہ کے نقوش سے واقف رہتے تھے، جیسا کہ تدریجی ارتقاء کا مغربی نظریہ بتاتا ہے اور یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ انبیاء کرامؑ جس دور سے گذرتے تھے ان کو صرف اسی دور کے تقاضوں کی خبر رہتی تھی، مغربی فکر کے اس انداز بحث ونظر کو قبول کرنے کی وجہ یہ ہے کہ واٹ اپنے تہذیبی ماحول ہی کا پروردہ ہے اور مغربی نظریہ کو اپنی کتاب میں کئی جگہ استعمال کرکے وہ بہت سی غلطیوں میں مبتلا ہوگیا ہے، مثلاً وہ قریش کی تینوں مورتیوں (لات، عزیٰ اور منات) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تسلیم کرنے والی بے سروپا کہانی کا ذکر کرتا ہے ہم اس سے پہلے قریش کے ساتھ انہام وتفہیم کی کوششوں اور شیطانی فقروں کے بارہ میں تفصیل سے بحث کرچکے ہیں یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں، تاہم واٹ نے مغربی نظریہ کی روشنی میں اس پر جو حاشیہ آرائی کی ہے اس کا ذکر کرنا ضروری ہے، اس کا خیال ہے کہ:

"تدریجی ارتقاء کے جدید مغربی نظریے سے مسلمان فقہاء ناواقف تھے، اس لیے ان کی رائے یہ تھی کہ محمدؐ اسلامی عقیدہ کے پورے مفہوم سے ابتداء ہی سے باخبر تھے، ان کے لیے یہ بات قابل قبول نہیں تھی کہ محمدؐ نے شیطانی فقروں کو (ابتداء میں) اسلامی عقیدہ کے خلاف نہیں سمجھا اور نہ واقعہ یہ ہے کہ محمدؐ کا عقیدۂ توحید ان کے تعلیم یافتہ معاصرین کے عقیدۂ توحید کی طرح اصل میں غیر واضح تھا، انھیں اس وقت تک یہ خیال نہیں آیا تھا کہ خداوند کی ان مخلوقات (۹) کو تسلیم کرلینا توحید کے منافی ہوگا، وہ لات، عزیٰ اور منات کو اس وقت تک خداوند سے کمتر مگر آسمانی مخلوق سمجھتے تھے جس طرح یہودیت اور عیسائیت میں فرشتوں کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے، قرآن نے مکی دور کے آخر میں (۹) ان کا تذکرہ "جن" کہہ کر کیا ہے، لیکن مدنی دور میں وہ ان کو بے حقیقت اور نام محض قرار دیتا ہے، اگر یہ سب کچھ ہوا ہو تو پھر یہ ضروری نہیں رہ جاتا کہ ہم شیطانی فقروں کا کوئی دوسرا سبب دریافت کریں کیونکہ یہ واقعہ توحید سے شعوری طور پر پسپائی کو ثابت نہیں کرتا بلکہ اس کے ذریعہ ان نظریات کی ترجمانی ہوتی ہے جن کی طرف سے محمدؐ نے ہمیشہ مدافعت کی ہے[1]۔"

(باقی)

---

[1] محمد ایٹ مکہ، ص ۱۷۰۔



# کشمیر میں اسلامی ثقافت کے تاریخی مراحل

از

ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری، استاد شعبۂ عربی، گورنمنٹ ڈگری کالج نوا کدل سرینگر کشمیر

(۴)

**عہد مغلیہ کی مشہور درسگاہیں** مغل بادشاہوں کے دور میں کشمیر میں جو امن وسکون اور معاشی خوشحالی عام ہوئی اس سے یہاں کے علم کے بازار کو خود بخود رونق حاصل ہوئی، بہت سے وہ علماء جو ہندوستان بلکہ ایشیا کے اہم ترین علمی مراکز سے مستفید ہوکر وطن واپس لوٹے تو ان کی کوششوں سے یہاں تعلیم وتدریس کی مجلسیں آراستہ ہوئیں، ان علماء کی رہائش گاہیں مستقل تعلیمی ادارے بن گئیں، یہی حال خانقاہوں کا ہوا، مغل حکمرانوں نے ان کے حق میں وہ جاگیریں پھر واگذار کیں، جن کو چک حکمرانوں نے ضبط کیا تھا، ان خانقاہوں میں ایک مرتبہ پھر بہار آئی، اور وہ بہترین تعلیمی اور تربیتی مرکز بن گئیں، یہاں اس دور کی چند مشہور درسگاہوں کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

**درسگاہ ملا حیدر** علامہ حیدر چرخی (تلمیذ شیخ عبدالحق محدث دہلوی) نے جہانگیر کے دور سلطنت میں گوجوارہ (سرینگر) میں یہ درسگاہ قائم کی، ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند اس کے مہتمم ہوئے تھے[1]، ڈاکٹر محی الدین صوفی لکھتے ہیں کہ کشمیر کے سربرآوردہ علماء اسی مدرسہ کے فارغ التحصیل تھے[2]

---

[1] تاریخ اعظمی۔ [2] کشیر (انگریزی)، از ڈاکٹر صوفی۔ ج ۳

محدث جلیل مولانا عنایت اللہ شال، مولانا عبدالرشید زرگر، مفتی محمد طاہر اور حضرت شیخ محمد چشتی رادھو جیسے اکابر علماء نے یہیں سے فراغت علمی حاصل کی تھی۔

**مدرسہ سید منصور** یہ مدرسہ ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء) میں وجود میں آیا تھا اسوقت مغل حکومت کی طرف سے کشمیر کی صوبیداری عنایت اللہ خاں کے سپرد تھی، جو قاضی موسیٰ شہید کی اولاد میں سے تھے۔ انھوں نے خود اس مدرسے کی سربراہی کی۔ اس مدرسے کے صدر مدرسوں میں مولانا سلیمان (فرزند مولانا ابوالفتح کلو) جیسے فاضل بھی رہے تھے، جو نہ صرف مدرس بلکہ عربی کے بلند پایہ مصنف اور محقق بھی ہوئے [۱]

**مدرسہ فاضل خان** فاضل خان بھی مغلوں کی جانب سے کشمیر کا گورنر تھا۔ وہ اپنی رعایا پروری، علم دوستی اور رفاہ عامہ کے کاموں میں مشہور تھا۔ اس نے اپنی ساڑھے تین سالہ صوبیداری کے زمانے میں سات سو چناروں کے پودے لگوائے۔ حسن آباد اور جوگی لنگر میں خانقاہیں تعمیر کیں، اسی طرح مسجد سنگین کے متصل ایک حمام اور ایک مدرسہ قائم کیا۔ [۲]

**خانقاہ شمسی چک** یہ خانقاہ تقریباً تین سو سال سے علم وعرفان کی پیاس بجھانے والوں کے لیے چشمۂ صافی کی حیثیت رکھتی تھی، حضرت شیخ حمزہ مخدوم رحمۃ اللہ علیہ نے اسی خانقاہ میں تقریباً بیس سال قیام کرکے مراتب عالیہ حاصل کیے تھے۔ [۳]

**خانقاہ میر سید علی ہمدانی** مغل بادشاہوں کے دور حکومت میں کشمیر کی اس قدیم ترین خانقاہ کی اپنی سابق رونق پھر واپس لوٹ آئی علماء وقت یہاں درس دیتے اور اصحاب قلم تصنیف وتالیف کا کام کرتے۔ حاجی محمد کشمیری (تلمیذ حافظ ابن حجر ہیتمی مکیؒ) نے اسی خانقاہ میں

[۱] کنٹری بیوشن ٹو عربک لٹریچر، از ڈاکٹر زبید احمد ۵۲ [۲] تاریخ اعظمی ص ۱۹۰ [۳] ایضاً ص ۱۸۹



علم حدیث کی کچھ اہم کتابوں کی شرح لکھی تھی۔ [۱]

**خانقاہ ملک جلال** ملک جلال ٹھاکور کی تعمیر کی ہوئی خانقاہ ایک اہم درس گاہ کی حیثیت بھی رکھتی تھی، مشہور عالم ملا حسین گنائی کے بارے میں مورخ محمد اعظم لکھتے ہیں۔

در خانقاہ ملک جلال تھکور درس مے گفت۔ [۲]

**خانقاہ نقشبندیہ** یہ خانقاہ نقشبندی سلسلے کے مشہور بزرگ خواجہ خاوند محمود صاحب سے منسوب ہے، جب شاہجہاں نے کشمیر کے شیعہ صوبیدار ظفر خاں احسن کے ابھار پر خواجہ صاحب کو کشمیر داخل ہونے پر پابندی لگادی تو اُن کے نامور فرزند خواجہ معین الدین نقشبندیؒ نے اپنے والد بزرگوار کا مشن آگے بڑھایا، اور یہ خانقاہ اس کا اہم مرکز بن گئی، اس خانقاہ میں کشمیر کے سرکردہ علماء اور شیوخ اکٹھے ہوکر علمی اور تبلیغی کاموں میں مشغول رہتے۔ خود خواجہ معین الدینؒ اور ان کے رفقاء نے فقہ کی مشہور کتاب الفتاوی النقشبندیہ یہیں مرتب کی، [۳] خواجہ صاحبؒ کے انتقال کے بعد ان کی باہمت اہلیہ نے اس خانقاہ کا انتظام وانصرام سنبھالا جس سے مدت دراز تک اس کا فیض جاری رہ سکا۔

**مدرسۂ ملا عبیداللہ** مُلا صاحب کشمیر کے سربرآوردہ علماء میں سے تھے، مورخ محمد اعظم ان کے شاگردوں میں سے تھے اور اس نے اپنی تاریخ میں اس نسبت تلمذ کا نہایت انکسار سے ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں، ملا عبیداللہ جملہ علوم وفنون بالخصوص معقولات کے عجوبۂ روزگار عالم تھے۔ شاہزادہ فرخ سیر ان کی بڑی قدر کرتا تھا، اسی نے انھیں فتاوی عالمگیری کا ترجمہ فارسی میں کرنے کا کام سونپا تھا، آگے لکھتے ہیں کہ دور دور سے طلبہ یہاں آکر مستفید ہوتے ہیں، ان کے شاگرد آسمان علم وفضل پر آفتاب وماہتاب بن کر چمکے۔

[۱] ہندوستان میں حدیث لٹریچر۔ از ڈاکٹر محمد اسحٰق ص ۱۳۵ [۲] تاریخ اعظمی ص ۱۳۳ [۳] ایضاً ص ۲۲۶

"چہ از مردم توران و ایران کہ دراں وقت وارد ایں شہرے شدند، چہ از مردم کشمیر کہ بہ زینت بخش مسند افادہ بودند بہرہ علم و ادب می اندوختند"[1]

اگرچہ وہ بہت کم اپنے معاصرین کو خاطر میں لاتے تاہم ملا محمد محسن کھشو کشمیری کی شاگردی پر فخر کرتے۔ مزید برآں وہ بڑے صالح اور متوکل بزرگ تھے۔ ان کا مدرسہ بھی باطنی برکات سے خالی نہیں تھا۔

تعلیم مدرسۂ آنجناب خالی از برکتے ہم نبود و تمن زیادتے داشت[2]

**عہد مغلیہ کے ممتاز علماء اور مدرسین**

مغلیہ عہد سلطنت میں کشمیر کے تشنگان علم کو عظیم ہندوستان کے بے شمار علمی اور فکری مراکز تک پہنچنے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی کچھ طلبہ علم کی پیاس بجھانے کے لیے افغانستان، ایران اور حرمین جاتے تھے، مگر اب ان کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا۔ مغل حکمرانوں نے کشمیر کو بے حد اہمیت دی۔ وہ بار بار یہاں آتے اور اُن کے ساتھ علماء و شعراء اور اصحاب فکر و علم یہاں وارد ہوتے، جس سے ثقافتی مجلسیں جم جاتی تھیں۔ یہاں کے علماء نے ان میں کھل کر حصہ لیا، گویا انھیں ایک وسیع و عریض سلطنت کا حصہ بنتے ہی اس کے فوائد و ثمرات کا حصہ دار ہونے کا احساس ہوا۔ کشمیر کے اِن تشنگان علم و معرفت نے ہندوستان کی خاک چھاننا شروع کی تو حیدرآباد سے لیکر بنگال تک بے جھجک پہونچے وہ عربی دینی علوم کے مدارس صوفیائے کرام کے مراکز اور اصحاب شعر و ادب کی مجالس میں پہنچتے یہاں خود بھی فائدے حاصل کرتے اور دوسروں کو بھی اپنی صلاحیتوں سے مستفید کرتے۔ شیخ یعقوب صرفی، شیخ حیدر داتو، علامہ حیدر، قاضی خاں، خواجہ معین الدین چشتی، شیخ محمد عاصمی[3] (برادر اصغر

[1] تاریخ اعظمی ص ۲۲۶ [2] ایضاً [3] شیخ محمد عاصمی، حضرت شیخ یعقوب صرفی (بقیہ حاشیہ ص ۳۵۳)



شیخ یعقوب صرفی کشمیری) علامہ داؤد خاکی، محدث داؤد مشکوتی، مولانا ابو الفتح کلو (اُن کے فرزند مولانا سلیمان کلو، علامہ عنایت اللہ شال، علامہ محمد محسن کھشو، مولانا محمد امین گانی محدث، علامہ عبدالرشید زرگر، مولانا محمد یوسف مدرس، مفتی محمد طاہر وغیرہ اس دور کے ایسے سربرآوردہ علماء تھے، جو اپنی علمی جامعیت، تصنیفی صلاحیت اور مدرسانہ فضل و کمال میں ہندوستان کے اُن باکمال علماء سے کچھ کم مرتبہ نہیں رکھتے تھے جنھیں اس زمانے میں مرجعیت حاصل تھی، ان کے علاوہ بابا فتح اللہ، مولانا محمد صالح (فرزند قاضی موسیٰ شہید) ملا حاجی گنائی، ملا عبدالرزاق بانڈے، قاضی محسن اندرواری، مولانا یوسف گنائی، مولانا عبدالشکور نیلو وغیرہم بھی غیر معمولی مدرسانہ صلاحیتوں کی وجہ سے سارے کشمیر میں شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ اسی طرح کچھ علماء کشمیر سے باہر ہندوستان کے مختلف اداروں کی زینت بنے۔ مثلاً ملا عبدالرزاق بانڈے کو شاہجہاں نے مدرسۂ کابل کا صدر مدرس بنا کر افغانستان بھیجا، مولانا محمد علی کشمیری عبدالرحیم خان خاناں کے منظور نظر بنے۔ خان خاناں ہی کے حکم پر انھوں نے ضیاء الدین ترکمانی کی عربی کتاب خاص کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ مولانا محمد حسین کشمیری پٹنہ (عظیم آباد) کے مفتی مقرر ہوئے، قاضی حیدر کو اورنگزیب نے قاضی خاں کا لقب دیا تھا۔ فتاویٰ عالمگیری کی تحقیقاتی مجلس میں وہ بھی شریک ہوئے تھے۔

غرض سلطنتِ مغلیہ میں کشمیر کے علمی بازار کو پھر ایک بار وہ رونق عود کر آئی جو چک حکمرانوں کی

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۲) (استاد حضرت مجدد الف ثانیؒ) کے چھوٹے برادر تھے، ظاہری اور باطنی علوم کی تحصیل حضرت صرفیؒ ہی سے کی تھی، انھوں نے خط ارشاد میں اپنے چھوٹے بھائی کے حق میں اس قسم کے وقیع الفاظ تحریر کئے ہیں:۔ "الاخ الصوری و المعنوی۔ ناظم الطریقۃ عارج معارج الحقیقۃ، الواصل من العلم الی العین"۔ نفحات کبرویۃ۔ شیخ عبدالوہاب نوری (قلمی)

نااہلی اور غفلت شعاری سے تقریباً ختم ہو چکی تھی مغل بادشاہ خود بڑے عالم، علم دوست اور علماء کے مرتبہ شناس تھے، اس سے جہاں سارا ہندوستان بہرہ ور ہوا وہاں کشمیر بھی محروم نہیں رہا۔

**درانی دور اور ذلت و نکبت کی ابتدا** اورنگزیب کے انتقال کے ساتھ ہی مغلیہ سلطنت پر جو فضا چھا گئی وہ کشمیر تک پھیل گئی۔ مرکز کی قوت کمزور ہوتے ہی کشمیر کا نظم ونسق بگڑ گیا۔ اقتدار پسندوں کی دوڑ دھوپ پھر شروع ہوئی جنھوں نے ایک بار پھر اپنی سیاسی آوارہ گردی سے عوام کا سکون درہم برہم کر دیا۔ اگر ان میں کوئی شخص مخلص، جرأت مند اور باغیرت ہوتا تو کشمیر کو کم از کم غیر ملکی استیلاء سے نجات دلا کر اپنے مقدر کا آپ مالک بنا سکتا تھا مگر بدقسمتی سے ان لوگوں میں سے کسی کی حیثیت ایسی نہ بن سکی۔ جب انھیں خوف وہراس اور فتنہ وفساد پھیلانے سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ تو اب ان کی آنکھیں افغانستان کے درانیوں کی طرف اٹھ گئیں۔ ان میں ایک شخص میر مقیم کنٹھ کے بارے میں ایک مورخ نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ وہی افغانوں کے کشمیر پر قبضہ جمانے کا محرک ہوا تھا۔[1] درانی سلطنت اسوقت احمد شاہ ابدالی کی قیادت میں پورے عروج پر تھی۔ اور احمد شاہ سکھوں اور مرہٹوں کی قوت توڑنے میں مصروف تھا، اس کی فوج کے ایک دستے نے کشمیر کو اپنی ترکتازیوں کا نشانہ بنایا اور کسی خاص مزاحمت کے بغیر مغل گورنروں کی نااہلی و کمزوری اور کشمیر کے سیاست گروں کے باہمی تعاون پروری سے فائدہ اٹھا کر ۱۷۵۲ء میں یہ فوج کشمیر پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گئی۔

احمد شاہ ابدالی بذات خود کشمیر کبھی نہیں آیا۔ وہ قابل اعتماد افغانوں کو صوبیدار بنا کر

[1] وجیز التواریخ (قلمی) مؤلفہ پنڈت بیربل کاچرو



کشمیر کا نظم ونسق سنبھالنے پر مامور کرتا تھا۔ کشمیر کی معاشی ومعاشرتی تباہی کے اصلی ذمہ دار یہی افغان صوبیدار اور ان کے حاشیہ بردار تھے۔ ان صوبیداروں نے جن میں اگرچہ کچھ لوگ دیندار اور اکابر صوفیہ کے ارادت مند بھی تھے مجموعی طور پر کشمیر میں شرمناک لوٹ کھسوٹ، وحشت گردی اور بربریت کی ہیبت یادیں تازہ کر دیں۔ اس دور کے ممتاز مورخ میر سعد اللہ شاہ آبادی، جمعہ خان صوبیدار ۱۷۸۸ء تا ۱۷۹۳ء کے ہمعصر تھے۔ ان کے درج ذیل اشعار سے ابدالی صوبیداروں کے زمانے کی زبوں حالی کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ؎

ظلم شاہاں وجور سلطانان — یکقلم کرد ملک را ویران
ہر کسے دختریست می خواہند — عورتان خود کنیزک شاہ اند
نائبِ شاہ بصوبہ کشمیر — کہ بود قلعہ گیریش تدبیر
کم دو از دختران بکارت فاش — غیر ازیں نیست قلعہ گیریہاش
شیوہ اش شوخی است وبیباکی — پیشہ اش غارت است وضحاکی
گر اماں از کفش طلب دارد — مادر کیقباد ننگ دارد
زیں عدد سک زنی کہ کاروے ست — مادرش بانوے حصارے ست
بس چہ گویم ز مملکت رانی — چند از خواندہ درس ویرانی
دہ چہ ظالم کہ نیست ثانی او — ایں زمیں را بحکم رانی او
ہر زمیں را کہ خواست او آباد — تخم وآتش زنہب وغارت داد
نیست درہیچ شہر پیشہ دری — کہ در شہر اوست بہر زری

آگے لکھتے ہیں:۔

عقد جمعیت از نظام افتاد — رخنہ در کار خاص و عام افتاد
ہمہ حیران تہی ز بار و ز برگ — مرز دایں بعث و نشر پیش از مرگ
شد قیامت چنانکہ نیست ضرور — مر اسرافیل را دمیدن صور
کار و بار ہمہ دریں بازار — بار ما رِ عیال و کار فرار

اس طرح افغانوں کے لوٹ کھسوٹ، غارت گری، عصمت ریزی اور بے انتہا حرص و ہوس نے کچھ دنوں کے اندر اندر حیرت ناک حد تک اس ہرے بھرے چمن کو اجاڑ دیا، ان حالات میں کسی نے درد و کرب کی حالت میں کہا تھا۔

پرسیدم از خرابیٔ گلشن ز باغباں
فغاں کشید و گفت افغاں خراب کرد

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جو ابدالیوں سے اُن کے مرہٹوں اور سکھوں کا مقابلہ کرنے کی وجہ سے حسن ظن رکھتے تھے، ان سے کشمیر کے اہل علم اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتے تھے، کیونکہ کشمیر میں ایسی بربریت اور بے حیائی و آبرو ریزی روا رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا، یہاں ان کی سنگ دلی کے بارے میں مشہور تھا کہ ان سنگ دلوں کے ہاں دھڑ سے سر اتارنا اتنا ہی آسان ہے جتنا پھول چننا۔[1]

درانیوں کے عہد حکومت ہی میں کشمیر میں کئی زلزلے اور سیلاب کی وجہ سے یہاں کے تمام باشندوں پر اضمحلال و افسردگی چھا گئی، ان حالات میں حکمران طبقہ لوگوں کے مصائب دور کرنے کے بجائے عیش و طرب میں غرق پڑا رہا، اور کسی بغاوت سے بچنے کے لیے مذہبی منافرت پھیلانے کی کوشش کی، چنانچہ اسی بدقسمت دور میں دو مرتبہ ایسے شیعہ و سنی فسادات ہوئے۔ جن میں فریقین نے ایک دوسرے کے مکانات کو چشم زدن میں راکھ کا ڈھیر کر دیا۔

[1] تاریخ حسن۔ ج اول



**افغان دور حکومت کے ممتاز علماء**

ان بدترین حالات میں کشمیر میں علوم و فنون کا رواج پانا ایک غیر متوقع امر تھا، بہت سے لوگوں نے پرانی سنت تازہ کر کے ہجرت اختیار کی، غریب عوام مفلوک الحال ہونے کی بنا پر بے حد مایوسی کے شکار ہوئے، یہی وجہ ہے کہ اس دور میں ہمیں کشمیر میں کوئی ایسا عالم نظر نہیں آتا ہے جو علمی تبحر اور جذبۂ تجدید و اصلاح میں کم از کم علامہ داؤد خاکیؒ یا خواجہ معین الدین نقشبندیؒ ہی کی طرح ہوتا۔ البتہ متاخر عہد مغلیہ کی مقتدر علمی شخصیتوں کے کچھ ایسے فیض یافتہ بزرگان دین جو ہجرت نہیں کر سکے، انھوں نے بقدر ظرف اپنی منصبی ذمے داریاں پوری کرنے کی کوشش کی، ان میں شیخ معین الدین رفیقی (م ۱۱۴۷ھ)، خواجہ نور الدین محمد آفتاب (م ۱۱۵۶ھ)، مولانا ابو الفتح (م ۱۱۴۹ھ)، شیخ سید عبد الوہاب منور آبادی (م ۱۱۵۳ھ) میر سید محمد اسماعیل بخاری ہمدانی (م ۱۱۵۳ھ)، جیسے مشائخ و علماء کے تلامذہ اور خلفاء و مسترشدین نے ارشاد و سلوک کا چراغ بجھنے نہیں دیا، ان میں شیخ رحمت اللہ، ملا محمد مقیم شیخ عبد السلام وکیل اور مولانا مفتی ابو الوفا وغیرہم کے اسمائے گرامی بھی قابل ذکر ہیں، جن کے بارے میں اس دور کے مورخ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری لکھتے ہیں۔

امروز چراغ افروز خانہ علم و عمل اند[1]

اس کے علاوہ اس دور میں کچھ سرکردہ علماء کشمیر وارد ہوئے جن سے بہت سے لوگوں نے علمی اور باطنی فیوض حاصل کیے، ان میں شیخ عبد الولی طرخانی اور میر محمد یوسف نقشبندی قابل ذکر ہیں، اوّل الذکر شیخ محمد عابد سندھیؒ محدث کے شاگرد تھے، اس طرح ان کے توسط سے کشمیر کے اہل علم طلبۂ حدیث سندھ کے ایک جلیل القدر محدث کے فیوض سے گھر بیٹھے فیضیاب ہوئے، مزید برآں کچھ تشنگان علم آس پاس کے ملکوں میں اب بھی جاتے تھے، چنانچہ اسی دور میں

[1] تاریخ اعظمی۔ ص ۲۶۶

بخارا میں بھی کشمیر کے کچھ طلبہ پائے گئے۔[۱]

**سکھ اور ڈوگرہ دور حکومت** افغانستان میں احمد شاہ ابدالی کی حکومت اس کے انتقال کے ساتھ ہی زوال پذیر ہوگئی۔ اس سے کشمیر بھی متاثر ہوا، اس وقت قدرت کی طرف سے کشمیر کے ارباب سیاست کو اپنی قوم کی تقدیر آپ بدلنے کے لیے ایک اور قیمتی موقع فراہم ہوا تھا۔ مگر وہ عاقبت نااندیشی اور ہوس اقتدار سے یہ بھی گنوا بیٹھے، اس دوران کشمیر میں کچھ دوسرے اندرونی اور بیرونی عناصر پیدا ہو چکے تھے، جنھوں نے حالات سے فائدہ اٹھانے کے لیے پوری تیاری کی تھی، جونہی سکھوں نے پنجاب میں اپنی حکومت قائم کی تو انھوں نے کشمیر پر بھی تیس ہزار فوجوں کی مدد سے حملہ کیا۔ اس وقت جبار خاں درانیوں کی طرف سے کشمیر کا صوبیدار تھا جب اسکو سکھوں کے مقابلے میں اپنی شکست کا یقین ہوا تو اُس نے پہلی فرصت میں لوٹ کھسوٹ کا مال اکٹھا کیا۔ اور اسے باربردار جانوروں پر لاد کر کابل کی طرف روانہ ہوگیا، اس طرح کشمیر سنہ ۱۲۳۴ھ مطابق ۱۸۱۹ء میں پنجاب کی سکھ سلطنت کا جزبن گیا۔

سکھوں کو کشمیر پر قبضہ جمانے میں اس مرتبہ سب سے اہم مدد یہیں کے کچھ سیاست آشنا پنڈتوں نے دی، جن میں پنڈت بیربل در اور اس کے بیٹے راجہ کاک در کے نام قابل ذکر ہیں، دراصل جونہی ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کمزور ہوگئی، اور سکھ، جاٹ اور مرہٹے ہندوستان کی سیاست پر حاوی ہونے لگے اسی وقت سے کشمیر کے کچھ ہندوؤں کے دلوں میں دبی ہوئی امنگیں انگڑائیاں لینے لگیں، اگرچہ انتہائی اقلیت میں ہونے کی بنا پر وہ بذات خود کوئی بڑا انقلاب لانے کے اہل نہیں تھے، تاہم انقلاب لانے والوں کو قیمتی مدد فراہم کرنے کی ضروری صلاحیت رکھتے تھے، اس کا بہترین موقع انھیں اسوقت حاصل ہوا جب درانیوں نے اپنے عہد حکومت میں پنجاب کے

---

[۱] کیمبرج ہسٹری آف اسلام۔ جلد اول ص ۴۰۹



ایک کھتری سوکھ جیون مل کو کشمیر کا صوبیدار بنا کر بھیجا۔ اس نے ابتدا میں اپنے انصاف پسند، علم دوست اور علما پرور ہونے کی نمایش کی جس سے وہ شروع میں ہر دل عزیز بن گیا، مگر کچھ دنوں کے بعد اس نے اپنی سیاسی حکمت عملی بدل دی، اس نے کشمیر کے پنڈتوں کو اپنا مقرب بنا کر مسلمانوں کی مذہبی آزادی سلب کرنے کی کھل کر کوشش کی۔ جن کشمیری پنڈتوں کو اس نے اونچے مناصب پر فائز کیا اُنھوں نے اپنے ہموطن مسلمانوں کو بڑی مصیبتوں میں مبتلا کر دیا، اس نے مہانند پنڈت در کو رئیس الملک اور مدار المہام بنایا، جس نے گاؤکشی اور اذان پر پابندی لگادی، کئی علما ناکردہ گناہوں کی پاداش میں قتل کیے گئے، جن میں شیخ عبدالولی طرخانی محدث بھی شامل ہیں، اگرچہ درانیوں نے سوکھ جیون مل کو اس کی اسلام دشمنی پر سخت وحشیانہ سزا ضرور دی مگر اس نے کشمیر میں جو روایت قائم کی تھی، وہ بدستور قائم رہی، سوکھ جیون مل کے بعد فتح خاں، مدد خاں اور غفار خاں وغیرہ صوبیداروں کے زمانے میں پنڈتوں کا کشمیر کے انتظامیہ میں عمل دخل اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ اپنے ہموطنوں کے لیے کسی راحت کا باعث نہیں بن سکے۔ مورخ سعد اللہ لکھتے ہیں:۔

تا بدیوانی یافت دخلِ ہنود ‏ ‏ ‏ ‏ دفتر ظلم را حساب افزود

غفار خاں صوبیدار کے بارے میں خاص طور پر لکھتے ہیں:۔

رتق و فتقش ہنود را فرمود ‏ ‏ ‏ ‏ شوکت و شانِ کافری افزود

کار ہندو چو د اثر گو نہ بود ‏ ‏ ‏ ‏ ملک را راستی چگونہ بود؟

جب سکھ برسر اقتدار آئے تو پنڈتوں کے حوصلے نہایت بلند ہوئے، پنڈت بیربل در نے سکھوں کو کشمیر پر حملہ کرنے کی منت سماجت کی، اس مقصد کے لیے اس نے اپنے بیٹے راج کاک در کو بطور یرغمال ان کے پاس رکھا، اور خود سکھ فوج کی راہنمائی کرنے لگا،

جب سکھ تسخیر کشمیر میں کامیاب ہوگئے تو انھوں نے اپنے ان محسنوں کی بڑی قدر کی۔ سکھوں نے اپنے ۲۷ سالہ دور حکومت میں کشمیر کے مسلمانوں پر جو بے پناہ مصیبتیں ڈھائیں اس میں انھیں پنڈت بیربل در جیسے درباری پنڈتوں کا تعاون بھی حاصل تھا، تاہم پنڈت موصوف کا یہ کارنامہ اس لحاظ سے قابل داد ہے کہ جب سکھوں نے حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ معلیٰ کو توپوں سے اُڑانے کا منصوبہ بنایا تو پنڈت مذکور نے خوفناک بلوہ پھوٹنے کے اندیشہ سے سکھوں کو ایسا کرنے سے روکا۔

**ظلم و استبداد** | ایک یورپی مقالہ نگار کشمیر پر افغانوں اور سکھوں کے مظالم کا موازنہ کرتے ہوئے یورپ میں بیٹھکر لکھتا ہے۔

"سکھ حکومت بھی ظالمانہ تھی مگر افغانوں سے پھر بھی اچھی تھی۔"[1]

اس کے برعکس یورپی سیاح مورکرافٹ، جو اس دور میں کشمیر آیا تھا، آنکھوں دیکھا حال ان الفاظ میں لکھتا ہے۔

"افغانوں کا ظلم منتشر تھا، جب کہ سکھوں کا ظلم و استبداد منظم ہے درانیوں کی لاپرواہی کے نتیجے میں کچھ لوگ لوٹ کھسوٹ سے بچ بھی جاتے تھے، جبکہ رنجیت سنگھ کا قہر و غضب منظم شکل میں ہے، رنجیت سنگھ کی حکومت حد درجہ ظالمانہ ہے"[2]

کشمیر کی تاریخ مورکرافٹ کے چشم دید حالات کی تائید کرتی ہے۔

سکھوں نے اقتدار سنبھالتے ہی اذان اور گاؤکشی پر پابندی عائد کی، جامع مسجد سرینگر پر تالا چڑھایا گیا، اور مورکرافٹ نے اپنی سیاحت کے دوران (۱۸۱۹ء تا ۱۸۲۵ء) اسے مقفل پایا تھا[3] اسی طرح دوسری بہت سی مسجدیں، جن میں نو مسجد سنگین بھی شامل تھی،

---

۱؎ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد دوم مضمون کشمیر ۲؎ ٹریولز از سر ولیم مورکرافٹ ج ۲ ص ۲۹۳ ۳؎ ایضاً ج ۲ ص ۲۹۴۔



نزولات میں شامل کر لی۔ ۱۲۳۵ھ میں رسوائے زمانہ سفاک ہری سنگھ نلوہ کشمیر کا صوبیدار بن کر آیا تو اس نے علماء اور مشائخ کے مناصب اور جاگیروں کو کالعدم قرار دے کر انھیں نان شبینہ کا محتاج بنا ڈالا، عام لوگوں کی حالت بیان کرتے ہوئے مورکرافٹ لکھتا ہے کہ۔ "ان کے پاس جو کچھ بھی ہے، اس کو چھینا جاتا ہے، سکھ حکمران کشمیریوں کو مویشیوں سے بدتر سمجھتے ہیں، کوئی سکھ کسی کشمیری کو قتل کرتا ہے، تو اس کو حکومت کی طرف سے سولہ سے بیس روپیے تک جرمانے کے طور پر ادا کرنے ہوتے ہیں، اس رقم میں سے مقتول کو چار روپیے دیے جاتے ہیں، بشرطیکہ وہ ہندو ہو، اگر مقتول مسلمان ہوگا۔ تو اس کے وارثوں کو صرف دو روپیے دیے جاتے ہیں۔[1] مورکرافٹ آگے لکھتا ہے:۔

"کشمیر کے لوگ ہمیشہ سے ایشیاء کے سب سے زیادہ باسلیقہ اور زندہ دل سمجھے جاتے تھے، اگر مدبرانہ نظام حکومت انھیں میسر ہوسکے تو ممکن ہے کہ یہ خوبیاں دوبارہ ان میں پیدا ہوجائیں۔ مگر اس وقت اس جیسی گری ہوئی نسل کا دنیا میں کہیں وجود نہیں ہے"[2]

سکھوں کی بربریت، لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارتگری سے جس طرح شمالی ہندوستان کے سارے مسلمان دوچار تھے، اسی طرح بلکہ ان سے کہیں زیادہ کشمیر کے باشندے بھی تھے، پھر ان میں افغان حکمرانوں نے پہلے ہی مزاحمت اور مدافعت کی قوت فنا کر ڈالی تھی، اس کمزوری نے سکھ حکمرانوں کو یہاں زیادہ جری اور بے لگام کر دیا تھا، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ اگر ایک طرف ظالم سکھوں کی خونخواری اور سفاکی پر ان الفاظ میں غم و اندوہ کا اظہار کرتے ہیں:۔

جزی اللہ عنا قوم مکہ ومرحب    عقوبۃ شر جزی غیر اجتب

---

۱؎ ٹریولز از سر ولیم مورکرافٹ ج دوم ص ۲۹۳ ۲؎ ایضاً ص ۱۲۸

وقد قتلوا جمعاً کثیراً من الوریٰ    وقد اوجعوا فی اھل شاء وجاھل

(خدا سکھوں اور مرہٹوں کو جلد ہی ان کی برائیوں کی سخت سزا دے، انھوں نے بہت سے لوگوں کو قتل کر دیا، یہاں تک کہ معصوم لوگوں اور چرواہوں کو بھی نہیں چھوڑا)

دوسری طرف کشمیر کے مسلمان اس طرح خون کے آنسو بہاتے تھے۔

جرم ما، مارا چو دامنگیر شد    قوم سنگادار دکشمیر شد

**ڈوگروں کی سودا بازی** سکھوں نے ۲۷ سال تک (۱۸۱۹ء تا ۱۸۴۶ء) کشمیر کو تاراج کیا۔ اس کے بعد جموں کے ڈوگروں نے انگریزوں سے ساز باز کر کے سکھوں کو اقتدار سے محروم کرنے اور کشمیر پر اپنا اقتدار جمانے میں کامیابی حاصل کی، ڈوگروں نے انگریزوں سے یہ سرزمین (بشمول ہزارہ و کوہستان) ۷۵ لاکھ مروجہ سکوں میں خریدی، یہ سیاسی تجارت خوبصورت وادی کے ساتھ ساتھ اس کے مظلوم باشندوں کے اجسام وارواح سمیت ان کی مطلق ناواقفیت کی حالت میں امرتسر کے مقام پر طے کی گئی۔

علامہ اقبال نے اسے افسوسناک سودا بازی سے تعبیر کیا۔ ؎

دہقان وکشت وجوے وخیاباں فروختند    قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند

اور جسٹس آدرش سین آنند نے اس تعبیر کو قانوناً صحیح قرار دیا ہے، جسٹس آنند لکھتے ہیں:

"کشمیر فروخت کرنے کے موقعہ پر اس کے اخلاقی اثرات کی جانب کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ بھیڑ بکریوں کی طرح لاکھوں لوگ بیچ ڈالے گئے، اور اس کاروبار کے موقع پر جو اہل کشمیر کی قطعی لاعلمی کی حالت میں طے کیا گیا، ان کے حقوق اور مستقبل کے بارے میں بیع نامہ امرتسر میں کوئی ذکر نہیں کیا گیا،



ہندو ڈوگرہ حکمرانوں کی طرف اکثریتی طبقے یعنی مسلمانوں پر حکومت کرنے کے لیے بے انتہا طاقت منتقل کی گئی۔[۱]

ظاہر ہے جن حکمرانوں نے یہاں کی زمین اور اس پر بسنے والوں کو لوٹنے کی غرض ہی سے خریدا تھا، وہ اسے کیا دے سکتے تھے، ڈوگروں نے تقریباً ایک سو سال تک (۱۸۴۶ء تا ۱۹۴۷ء) کشمیر پر حکومت کی، یہ مدت بالخصوص اس کا ابتدائی دور تاریخ کا ہیبت ناک اور دل ہلا دینے والا دور گزرا ہے، اس دور کی حالت کا تھوڑا سا اندازہ ان مغربی سفیروں کے سفرناموں سے بھی لگایا جا سکتا ہے، جو سیاحت کی غرض سے اُس دور میں کشمیر وارد ہوتے تھے، ان میں برنکمن (Sir Arthus - Brinkman) تھورپ Robert Thorp اور ڈگبے - Sir William Digbay کے سفرنامے مطالعہ کے لائق ہیں، ان کے پڑھنے سے ہر اس شخص کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، جن میں انسانیت کی معمولی رمق بھی موجود ہو۔ برنکمن برطانوی حکومت کو آگاہ کرتے ہوئے لکھتا ہے، کہ "ہر سال سینکڑوں کشمیری باشندے ظلم وجبر اور عام بدنظمی کی تلخی سے نجات پانے کی غرض سے اپنا وطن، اہل وعیال اور گھر بار چھوڑ کر پہاڑوں کی طرف بھاگتے ہیں"[۲] برنکمن آگے لکھتا ہے، "غلامی تمام حیثیتوں سے کشمیر میں موجود ہے، کوئی بھی کشمیری اپنی کسی چیز کا مالک نہیں ہے، زمین، پانی، لکڑی یہاں تک کہ اس کی روح بھی اس کی اپنی نہیں ہے، یہ لوگ تمام حقوق سے محروم ہیں، اور یہ سب کچھ ڈوگرہ

---

[۱] دی ڈویلپمنٹ آف کونسٹی ٹیوشن آف جموں اینڈ کشمیر اے۔ ایس۔ آنند دہلی ۱۹۸۰ء ص ۱۳

[۲] کشمیر پیپرز ص ۱۰ — علامہ اقبال نے کشمیریوں کی یہی ناگفتہ بہ حالت مشاہدہ کرنے کے بعد بڑے دکھ کے ساتھ کہا تھا:

بریشم قبا خواجہ از محنت او    نصیب تنش جامۂ تار تارے

سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اس کا    دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالہ

حکمرانوں کے بدولت ہو رہا ہے"[1] بیعنامہ امرتسر کا ہیرو گلاب سنگھ ڈوگرہ تھا، جو اپنے دور میں جواہرات کا رسوائے زمانہ چور تھا، وہ اس قدر لالچی تھا، کہ ایک روپے پر جھپٹ پڑتا تھا۔[2] اس کی طبیعت کی دناءت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے، کہ اگر کسی مصیبت کے مارے کو مہاراجہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی ضرور لاحق ہوتی تھی تو وہ دور سے ایک روپیہ دکھا کر کہتا تھا، عرض ہے! اور مہاراجہ متوجہ ہوتا تھا۔[3] اس کی سنگدلی کا یہ عالم تھا۔ کہ اس کے حکم سے مجرم کا پہلے مثلہ کیا جاتا تھا، پھر پھانسی دی جاتی تھی"[4] کسانوں اور مزدور طبقے کی حالت ناگفتہ بہ تھی، وہ رات دن محنت کرنے کے باوجود پیٹ پالنے اور جسم ڈھانکنے کے قابل نہیں تھے، جس طرح یہاں کے مسلمان جموں کے ظالم حکمرانوں سے خوفزدہ تھے اسیطرح وہ ان اہم وطن پنڈتوں سے بھی مایوس تھے، جو انتظامیہ پر چھائے ہوئے تھے، والٹر لارنس نے لکھا ہے کہ اگرچہ یہ لوگ تعلیم اور ذہانت میں اپنے ہموطن مسلمانوں سے فائق ہیں، مگر دفتری ملازموں کی حیثیت میں یہ لوگ بے انتہا حریص، ظالم اور تنگ نظر ثابت ہوئے ہیں۔[5]

**مسلمان معاشرے کی تباہی اور عقائد میں فساد**

ظلم جبر اور لوٹ کھسوٹ کی مسلسل ڈیڑھ سو سالہ حکومت سے کشمیر جیسی چھوٹی سی مملکت کے باشندوں کا معاشرہ اور کردار و عمل معتدل رہنا ناممکن تھا، ابتداء میں انھوں نے تھوڑی سی مزاحمت ضرور کی مگر بہت جلد ظلم کے آگے اس حد تک سپر انداز ہوئے کہ غیروں کے نزدیک "ظلم پرست" کہلانے لگے، اس سے

[1] کشمیر پیپرز۔ ص ۱۰۔
[2] The Jammu and Kashmir Territories, London, 1875, P50
[3] Kashmir Papers, P X - XI
[4] The Jammu and Kashmir Territories, Fr. Drew P50.
[5] The Valley of Kashmir: P 282



جہاں چار سمت تاراجی اور خانماں بربادی کی مہیب فضا چھا گئی، وہاں رفتہ رفتہ قنوطیت اور افسردگی کا ایسا عالم طاری ہوا، جس کی مثال کشمیر کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے، جو قوم اپنی ذہانت اور عقلمندی میں سارے ایشیا میں مشہور تھی، بہت جلد فاسد اوہام، باطل عقائد اور جھوٹے عجوبات کی اسیر ہو گئی۔ مذہبی پیشواؤں کی جگہ ان لوگوں نے لی جنھوں نے سیدھے سادے لوگوں کو خوابوں، کرامتوں اور جنتر منتر کے چکر میں الجھا دیا، علم و تحقیق کی جگہ قصہ خوانی نے لی، قرآن و حدیث اور فقہ و عقائد جیسے علوم کے بدلے رمل و جفر اور عملیات رواج پانے لگے، اب وہ واعظ منبر و محراب پر نمودار ہونے لگے جو تصوف اور تزکیۂ نفس کے نام پر زندگی سے نفرت اور فرار اختیار کرنے کی تبلیغ کرتے تھے، اس قسم کے مواعظ سے مسلمانوں سے قوتِ ارادی، کشمکش زندگی، مذہبی حمیت اور عزتِ نفس کی حس دیکھتے دیکھتے نابود ہو گئی۔

مولانا حیدر بن جمال الدین کشمیری (م ۱۲۴۳ھ) اس دور کے واعظوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ لوگ دلربا الفاظ اور خوشنما نکات سے عاقلوں کو بے ہوش کر کے انھیں عقل و فکر سے محروم کرتے ہیں، ان لوگوں پر رعونت سوار ہے اور عقل و علم سے محروم ہونے کے باوجود اپنے آپ کو سب سے بڑے عالم اور عارف سمجھتے ہیں، حالانکہ ان کے اعمال ایسے ہیں کہ فاسق و فاجر ملحدوں اور ہندو برہمنوں کو بھی شرمندہ کر دیتے ہیں، عوام الناس گدھوں کے مانند ہو گئے ہیں، وہ نابینا ہو کر اپنی داناؤں کی پیروی کرتے ہیں۔

از عوام الناس چہ گویم کہ ایشان نابینایند و در حقیقت تابع ہمیں دانایند۔[1]

مولانا حیدر یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی بہی خواہ ان لوگوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین کرتا ہے، یا ملحدوں اور بدعقیدوں کو لگام دینے کی کوشش کرتا ہے، تو

[1] تنویر السراج (قلمی)

یہ لوگ اسے پاگل ٹھہراتے ہیں۔[1] بے عمل درویشوں اور ملنگوں کے ساتھ عقیدت ہونے لگی۔ حالانکہ صوفیائے کشمیر نے اپنے زمانے میں انھیں سر اٹھانے کا بھی موقع نہیں دیا تھا۔

اسی طرح اسی تنزل و انحطاط کے زمانے میں کشمیر کے بہت سے مسلمانوں میں نسلی غرور اور آباء پرستی کی وبا پھیل گئی، جس نے بہت جلد کھلی برہمنیت کی شکل اختیار کرلی۔ حضرت حبیب اللہ حبّی نوشہری نے بہت پہلے کشمیر کے مسلمانوں کو یہ وعظ و نصیحت فرمائی تھی ؎

نہ حَسَب کار دہد نیز جبیانہ نسب — ترکِ دعوی فلاں ابنِ فلاں باید کرد

ہرگز مگو کہ خواجہ ام وخواجہ زادہ ام — یا — فخرِ عباد خاص ز حسنِ عبادت است

مگر جب بصیرت پر جہالت کے پردے پڑگئے تو مقدس اسلاف کے نصائح سننے کی صلاحیت بھی ختم ہوگئی، جن سادات نے صرف دو صدیاں پہلے اپنے علم و عمل سے کشمیر کو گہری برہمنیت سے نکال کر ایشیا کا اہم ترین اسلامی مرکز بنایا تھا، اب ان ہی کے اخلاف اپنی نالائقی اور بدتوفیقی سے اپنے اسلاف کے لیے باعثِ رسوائی بن گئے۔ مشہور صوفی اور مرتاض بزرگ شیخ نظام الدین فوراہی کشمیری (م ۱۲۶۱ھ)، نے اپنے دور کے سیدوں کے افسوسناک حالات کا ان دو اشعار میں نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے ؎

سیّدان و زمانہ سید انند — در لباسِ حسینؓ یزیدانند

آدم از خاک سیّد از نور ست — آدمیت ز سیدان دور ست[2]

اسی دور میں فتویٰ فروشی بھی اپنی تمام قباحتوں کے ساتھ وجود میں آگئی، صرف شہر سرینگر میں چار[3] حریف قاضی نمودار ہوئے، جو ایک دوسرے سے دست و گریباں رہتے تھے، وہ واقعات کی تحقیق کرنے سے اپنے کو بری الذمہ سمجھتے تھے، اس لیے

---

[1] دیوان حبّی (قلمی) [2] تاریخ حسن ج ۳



ان کے فتووں سے جھگڑوں میں اضافہ ہوتا تھا۔ لارنس نے لکھا ہے کہ قاضی صاحبان کے اس غیر ذمہ دارانہ وطیرہ سے کشمیر میں "تنہا بہ قاضی" کا محاورہ مشہور ہوگیا ہے۔[1]

برے رسوم اور بدعات سیئہ نے ہیبت ناک صورت اختیار کرلی تھی، اس میں شک نہیں ہے کہ اولیاء اللہ سے کشمیر کے مسلمانوں کی عقیدت و محبت ہمیشہ ہی ان کی عظیم الشان پونجی رہی ہے، مگر اس زمانے میں اس نے ایک ایسی صورت اختیار کرلی تھی جو ایمان ویقین کو غارت کرنے کے لیے کافی تھی، لارنس نے یہی صورت حال دیکھ کر لکھا ہے کہ کشمیر کے مسلمان دل کے ہندو ہیں۔[2]

**اصلاحی کوششیں** اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ان سخت تاریک حالات میں بھی مختلف گوشوں میں کچھ اللہ کے بندے اصلاح و تبلیغ کے لیے تڑپتے تھے، اگرچہ گھٹا ٹوپ ظلمت کے آگے ان کی روشنی بہت ہی معمولی تھی، مگر پھر بھی اس سے بہت سے بھٹکے ہوئے بندوں کو ہدایت کا راستہ نظر آیا۔

سلسلہ اصلاح و تبلیغ کی ابتدا حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کی مجاہدانہ سرگرمیوں سے ہوئی، ان دونوں بزرگوں کی کشمیر کے ابتر سیاسی اور معاشرتی حالات پر بھی نظر تھی، کشمیر ان کی تحریک سے عملاً اس وقت متاثر ہوا، جب بالاکوٹ مجاہدین کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا، اور ان ایام میں بالاکوٹ اہل کشمیر کی سیرگاہ تھا، مجاہدین میں کشمیر کے کچھ مسلمان بھی شامل تھے، جن میں حاجی یوسف غازی خاں کشمیری کا نام تاریخوں میں محفوظ ہے۔[3] تاہم یہ کشمیری مسلمانوں کی ایک اور بدقسمتی تھی کہ جب حضرت سید احمد بریلویؒ اور حضرت شاہ محمد اسماعیلؒ نیز ان کے پیروکار مجاہدین نے جنوری ۱۸۳۱ء میں کشمیر داخل ہونے

---

[1] دی ویلی آف کشمیر ص ۲۹۵ [2] ایضاً ص ۲۸۲ [3] سیرت سید احمد شہید، مولانا غلام رسول مہر ص ۳۱۳۔

اور یہاں کے باشندوں کو سکھوں کے ظلم وستم سے خلاصی دلانے کی خواہش ظاہر کی تھی، تو اس سے پہلے ہی سکھوں کی ایک یلغار میں یہ دونوں جلیل القدر مجاہدینِ اسلام شہید ہوئے اور کشمیر آنے کی نوبت نہیں آئی۔

اصلاحی تحریک کا ایک دوسرا سلسلہ عدم تقلید کے علمبرداروں کی جانب سے شروع ہوا، یہ لوگ زیادہ تر میاں نذیر حسین صاحب دہلوی مرحوم اور نواب سید صدیق حسن خاں قنوجی مرحوم کے تربیت یافتہ تھے، مگر ان لوگوں کو زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکی، ان میں ممتاز عالم اور مصنف مولانا عبدالرشید شوپیانی کشمیری بھی تھے، جو سیاسی ناکامی کی حالت میں ہجرت کر کے بھوپال پہنچے، اور وہاں نواب صدیق حسن خان کے دامن امارت سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں انھوں نے کافی مدت تک نواب صاحب کے علمی معاون کے طور پر کام کیا۔ اور عربی میں کئی علمی رسائل لکھے۔ جن میں حافظ ابوالبرکات ابن تیمیہ کی مشہور تصنیف "المنتقی" پر ان کا فاضلانہ مقدمہ بھی شامل ہے، اور "نُزُلُ مَنِ اتَّقٰی بشرحِ احوالِ المنتقی" کے نام سے موسوم ہے۔ کافی وقت کے بعد نواب صاحب اُن سے ناراض ہوئے، اور انھیں ہوشنگ آباد جلا وطن کیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے اسی حال میں شہر جبلپور میں انتقال کیا۔

مولانا عبدالرشید کے بعض تاثرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کشمیر کے مسلمانوں سے سخت ناراض تھے، جس کی وجہ یہ دکھائی دیتی ہے، کہ انھوں نے یہاں تبلیغ و اصلاح کے نام پر نزاعی مسائل پر زیادہ زور صرف کیا ہوگا۔ جس سے نہ صرف ان کا اصلاحی مقصد پورا نہیں ہوگا، بلکہ ان کے اور دوسرے مسلمانوں کے لیے نقصان دہ بھی ثابت ہوگا، ان کے ہمعصر



مورخوں بالخصوص حسن اور لارنس کی بعض نگارشات سے اس کی "تائید ہوتی ہے، مولانا نے ایک جگہ اپنی ناراضگی کا اظہار اس طرح کیا ہے،

اللہ نے کشمیر کے مسلمانوں پر ایک ایسا ظالم حکمران مسلط کیا ہے جو ان کے بیٹوں کو ذبح کرتا ہے، اسی طرح انھیں حضرت یوسفؑ کے زمانے کے قحط میں مبتلا کیا ہے، بیشک اللہ طاقت والا اور انتقام لینے والا ہے۔[1]

حاکم سے جموں کے ڈوگرہ حکمران مراد ہیں، قحطِ یوسف سے وہ تاریخی قحط سالی مراد ہے، جس میں ہزاروں کشمیری مسلمان لقمۂ اجل بن گئے تھے۔

تبلیغ و اصلاح اور تحقیق و تدریس کا تیسرا سلسلہ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب دہلویؒ کے کشمیری تلامذہ کی جانب سے شروع ہوا تھا، ان کی صحیح تعداد ہمیں معلوم نہیں ہو سکی، صرف تینؔ بزرگوں کے نام تاریخ و تراجم کی کتابوں میں ملے، جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) حضرت شیخ احمد واعظ (۲) مولانا سید سعید اندرابی (۳) شیخ احمد ترابی۔

ان میں اوّل الذکر دو بزرگ متبحر عالم، جلیل القدر مصنف اور اپنے دور کے ممتاز مدرس و مبلغ تھے، ان تینوں بزرگوں نے انتہائی نامساعد حالات میں درس و تدریس اور تبلیغ دین کے فرائض انجام دیئے، شیخ احمد واعظ کا دائرۂ وعظ و تبلیغ پنجاب تک پھیل گیا تھا، یہاں تک کہ واعظ ان کے نام کا غیر منفک جزو ہی بن گیا، انھوں نے متنوع دینی موضوعات پر عربی اور فارسی میں ستر سے زائد رسالے لکھے جن میں آج صرف تین عربی رسائل موجود ہیں، ان میں ایک رسالہ "تنبیہ الغافلین" کے نام سے موسوم ہے، یہ رسالہ بدعت کی رد میں لکھا گیا ہے، جو ان کے زمانے میں غلط کار واعظوں کی

[1] المنتقی۔ مطبوعہ فاروقیہ دہلی ۱۲۹۶ھ ص ۳۵ (حاشیہ)

جہالت سے کشمیر کے سادہ لوح مسلمانوں میں رائج ہو گئی تھی، یہ لوگ اس بدعت کی تائید میں
جو دلائل پیش کرتے تھے، انھیں رد کرتے ہوئے شیخ احمد واعظ لکھتے ہیں :۔

کچھ لوگ اس کے حق میں وہ دلائل پیش کرتے ہیں جو کسی طرح اطمینان بخش نہیں
ہیں، نہ وہ عقل و وجدان کے موافق ہیں، اور نہ نقل و تواترش سے مطابقت رکھتے
ہیں، یہ فقط کسی جھوٹی خبر اور جعلی حدیث پر قائم ہے، یہ لوگ ایسا کر کے خدا پر جھوٹ
باندھتے ہیں، حالانکہ ان لوگوں کو معلوم ہے کہ جائز کیا ہے، اور ناجائز کیا ہے۔

ایک اور جگہ ایک موضوع حدیث پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

خدا کی پاک ذات اس سے بلند ہے، یہ ایک بڑا بہتان اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کی ذات مقدس پر افترا، نیز آپ کی شان میں جسارت و جرات ہے، اس قسم کی باتوں سے اکثر
لوگوں کی طبیعتوں میں سستی پیدا ہوئی، کیونکہ لوگوں کے مزاج عموماً نیکیوں سے دور
اور برائیوں کی طرف راغب ہوتے ہیں، اس طرح انھوں نے اس قسم کی بے بنیاد
باتوں کا سہارا لیکر اطاعت و دیانت چھوڑ دی اور اس کے بدلے بطالت و گمراہی
کی طرف مائل ہو گئے، جس کے نتیجے میں وہ ایک طرف عیش و عشرت کی زندگی گزارنے
میں غرق ہوئے، اور دوسری طرف نماز ضائع کر کے خواہشات کے غلام بن گئے، وہ
جلد بُرے انجام کا سامنا کریں گے۔

اسی طرح انھوں نے ان لوگوں کے خلاف بھی قلم اٹھایا جو توحید اور عدم تقلید کے
نام پر احسان و تصوف سے یکسر منکر تھے، اور اولیاء اللہ کے روحانی فیوض و برکات کا انکار
کر کے ان سے استفادہ کرنے کو ناجائز اور خلاف شریعت سمجھتے تھے، اس جماعت کے
خلاف ان کا ایک دوسرا عالمانہ عربی رسالہ نجوم الشہابیہ کے نام سے علمی حلقوں میں بہت



مشہور و مقبول ہوا تھا۔

مولانا سید سعید اندرابی بھی بلند پایہ محدث اور مفسر تھے، انھوں نے درس و تدریس، تصنیف
و تالیف کے ذریعہ دینی علوم کی اشاعت کی۔ بے شمار طلباء علم ان سے مستفید ہوئے تھے،
وہ ایک ضخیم تفسیر کے مصنف بھی تھے، اسی طرح حدیث کی کئی اہم کتابوں پر حاشیے بھی لکھے۔

دور حاضر میں دوسری مسلمان مملکتوں کی طرح کشمیر بھی متعدد عصری تحریکات سے متاثر
ہوا مگر بدقسمتی سے کوئی قابل ذکر فائدہ حاصل کرنیکے بجائے متعدد نقصانات کا شکار ہوا ہیں
چھوٹے سے خطۂ زمین میں مذہبی جماعتوں کی کمی نہیں ہے، مگر اس کے باوجود یہاں غیر اسلامی
سرگرمیوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے، آج جب کہ یہاں کی تاریخ بڑی تیزی سے بدل
رہی ہے، دینی جماعتوں میں اس احساس کا بڑا فقدان ہے جسے شاعر مشرق نے قوم کو
زندہ رکھنے کے لیے نہایت ضروری قرار دیا ہے، اور اللہ سے یہ نعمت عطا کرنے کی دعا کی ہے

احساس عنایت کر آثار مصیبت کا امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

تاہم ان حالات میں جموں و کشمیر ادارۂ اوقاف اسلامیہ کی ان تعمیری خدمات کا اعتراف کرنا
ضروری ہے جو وہ مساجد کی تعمیر، مسلمانوں کے ثقافتی مراکز کی حفاظت، تعلیم کی اشاعت اور زیارتگاہوں
کی توسیع میں انجام دے رہا ہے، کشمیر میں ادارہ اوقاف کے بانی شیخ محمد عبداللہ مرحوم تھے،
اور وہ آخر دم تک اس کے سرپرست تھے، ان کی سرپرستی میں یہ ادارہ فعال بن گیا اور اپنی
کئی خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود قابل قدر خدمات انجام دیتا رہا۔ تازہ ترین رپورٹ
کے مطابق یہ ادارہ صرف تعلیم و تدریس کے شعبے پر سالانہ ۱۵ لاکھ روپیہ خرچ کرتا ہے، ان میں
ڈیڑھ سو سے زیادہ وہ جز وقتی مکاتب بھی شامل ہیں، جن میں صرف قرآن اور دینیات کی
تعلیم دی جاتی ہے، اور جو مدارس سرکاری نصاب کے لئے مخصوص ہیں، ان میں بھی قرآن مجید

اسلامیات اور عربی پڑھانے کا باقاعدہ انتظام ہے، اور ان مضامین میں طلبہ کا کامیاب ہونا ضروری ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سالانہ رپورٹ برائے ۸۶-۱۹۸۵ء مطبوعہ سری نگر)

**کشمیر کے مہاجر اور ارباب فکر و سیاست**

کشمیر کے باشندوں کو مختلف زمانوں میں مختلف حادثات و واقعات سے گزرنا پڑا، سیاسی بدنظمی، معاشی بدحالی اور آفات سماوی وقت وقت پر یہاں کے لوگوں کو جان بچانے کے لئے ہجرت پر مجبور کرتی تھیں، مسلمانوں کے اقتدار سنبھالنے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ اگرچہ شاہمیری دور سکون و اطمینان کا دور تھا، اور کشمیر خود غیر ملکی مہاجروں کا پناہ گاہ بن گیا تھا، مگر چکوں کے برسر اقتدار آنے کے ساتھ ہی کشمیر میں سیاسی اور مذہبی بغض و عناد کی آگ لگ گئی، اس کے نتیجے میں یہاں کے بہت سے اہل علم کشمیر کو خیر باد کہنے پر مجبور رہو ہے، یہ لوگ اس وقت کے ہندوستان کے مختلف فکری اور تمدنی مقامات میں مقیم ہوئے، پنجاب خاص طور پر کشمیری مہاجروں کا مرکز تھا، یہیں مولانا فتح اللہ مولانا کمال الدین اور اُن کے بھائی مولانا جمال الدین بھی مقیم ہوئے جو پنجاب میں اپنے تدریسی کمالات میں بے حد مشہور ہوئے تھے، اور جنھیں پنجاب کے شیوخ و ارباب کمال کے اساتذہ ہونے کا شرف حاصل ہوا مغلوں کے زمانے میں اگرچہ جبری ہجرت کا سلسلہ رک گیا، تاہم بہت سے علماء نے کشمیر کی چار دیواری سے باہر نکل کر وسیع و عریض ہندوستان ہی میں رہنا پسند کیا تھا، کشمیر جیسا چھوٹا ملک اپنی جغرافیائی خصوصیات کی بنا پر ہمیشہ بیرونی دنیا سے کٹ کر رہتا تھا، اور عموماً تہذیب و تمدن اور افکار و نظریات کی کشمکش اور آویزش سے نا آشنا رہتا تھا، گویا یہ سکون اور خاموشی کا ایک مقام تھا، جہاں کشمکش زندگی میں سرگرم حصہ لینے والے کچھ وقت کیلئے آرام کرنے آتے تھے، اسی لئے کشمیر کے جو لوگ زندگی کی دوڑ دھوپ میں حصہ لینے کے خواہشمند ہوتے تھے، وہ کشمیر سے ہجرت کرتے تھے، اس طرح مختصر سی مدت میں کشمیر کے بہت سے مسلمان دہلی، لاہور، لکھنؤ،



نیز فیض آباد، حیدر آباد وغیرہ میں آباد ہوئے، پنجاب میں کشمیری مسلمانوں کی ایک مستقل انجمن "انجمن کشمیری مسلمانان پنجاب" کے نام سے موسوم تھی، ایک بار محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس زیر صدارت سر سلیم اللہ نواب ڈھاکہ منعقد ہوا تو علامہ محمد اقبال رح نے اس جلسہ میں مہاجر کشمیری مسلمانوں کے مسائل بھی ابھارے تھے، ایک جگہ فرماتے ہیں۔

پوشیدہ نیست کہ اسلاف، بغرض سیر و سیاحت و ترقی و تجارت و حصول روزگار راہ غربت گرفتند و از خطہ جنت نظیر خویش انفراق نمودہ درین مملکت ہندوستان بہ مقامات مختلفہ اقامت ورزیدند" (تاریخ اقوام کشمیر منشی محمد دین فوق۔ ج ۱ ص ۳۲۸ لاہور)

افغانوں، سکھوں اور ڈوگروں کے پونے دو سو سالہ ظالمانہ دور حکومت میں بے شمار کشمیری مسلمانوں نے کشمیر سے ہجرت کر کے ان مقامات کی جانب رخ کیا جہاں اُنکے قدیم ہم وطن پہلے ہی مقیم ہو چکے تھے، ان مہاجر کشمیریوں نے آزاد ماحول میں زندگی کے ہر شعبے میں اپنی مخفی صلاحیتوں کا ثبوت دیا، تعلیم و تدریس تصنیف و تالیف، صنعت و تجارت اور فکر و سیاست میں اس قدر حصہ لیا کہ برصغیر کی تمدنی تاریخ میں اپنا علیحدہ اور مخصوص مقام حاصل کیا، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح کے ممتاز ترین شاگردوں اور ان کے علوم و افکار کے معدودے چند ماہروں میں خواجہ جمال الدین محمد امین ولی اللہی کشمیری رح متفقہ طور پر درجہ اوّل کے فاضل تسلیم کئے جاتے ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رح نے اپنے نامور والد کے بعد انہی سے استفادہ کیا تھا، جس زمانے میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رح کی جلیل القدر تالیف "تحفہ اثنا عشریہ" پورے ہندوستان میں مورد بحث و مناظرہ بنی ہوئی تھی، تو مولانا رشید الدین خان اہل سنت والجماعت کی طرف سے شیخ محمد بن عنایت شیعہ فرقہ کی جانب سے صف اوّل کے مناظر و متکلم کی حیثیت سے مشہور ہوئے تھے، اور یہ دونوں کشمیر الاصل عالم تھے، اور اتفاق سے دونوں حضرت شاہ صاحب رح کے شاگرد تھے، آگے علمی تبحر اور جامعیت میں صدر الصدور

مفتی صدر الدین خان آزردہ، محدث العصر علامہ محمد انور شاہ، تبلیغ و مناظرہ میں مولانا ثناء اللہ امرتسری عقلی علوم کی مہارت میں علامہ تفضل حسین خان، خطابت و سرفروشی میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، طب و حکمت میں نواب معالج خاں، اکابر شیعہ علماء میں مولانا ابو القاسم حائری، ان کے فرزند شمس العلماء سید علی حائری، مولانا ابو الحسن بن نقی شاہ فکر و فلسفہ کے تبحر میں علامہ محمد اقبال اور سر سید احمد خاں کے سرگرم علمی معاون مولوی چراغ علی جیسی باکمال شخصیتیں کشمیر سے تعلق رکھتی تھیں، انھوں نے اپنی گہری علمی اور فکری صلاحیتوں سے ان ظالم حکمرانوں کے منصوبے خاک میں ملا دیئے، جو دور سے آکر یہاں کے باشندوں پر مسلط ہو گئے تھے، اور منصوبہ بند طریقے پر ان کی تاریخ مٹانے کے درپے تھے، اگرچہ کشمیر کے مسلمان ان جلیل القدر مہاجر ہموطنوں کی صلاحیتوں سے براہ راست بہت کم مستفید ہوئے، اور شاید ملا طاہر غنی کشمیری نے یہی بدقسمتی محسوس کر کے اپنا یہ مشہور حسرت بھرا شعر کہا ہوگا ؎

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن  
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

تاہم کشمیر کے مسلمان ان بزرگوں کے فیوض سے یکسر محروم بھی نہیں رہے، کشمیر کے تشنگان علم اپنے ہموطن اکابر سے مستفید ہوئے تھے، خود ان مہاجرین کی کشمیر کے حالات پر نظر رہتی تھی، وہ یہاں کے باشندوں کے مسائل سے بے چین رہتے تھے، اور ان کے خلاف آواز بھی بلند کرتے تھے۔

---

## کشمیر سلاطین کے عہد میں

مغل فرماں رواؤں سے پہلے کشمیر میں جن مسلمان حکمرانوں کی حکومت رہی ہے، ان کے پورے دور حکمرانی کی نہایت ہی مستند اور مفصل سیاسی اور تمدنی تاریخ۔

مترجمہ۔ علی حماد عباسی، لکچرر شعبہ انگریزی شبلی کالج اعظم گڈھ



# صحافت کے زیر سایہ عربی نثر کا ارتقاء
## اور مشہور ادبی رسائل و مجلات

از

ڈاکٹر محمد محسن عثمانی ندوی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

عربی نثر کی تاریخ مختلف دور سے گذری ہے، پہلی صدی ہجری میں عربی نثر کے دو رنگ اور دو نمونے ملتے ہیں، ایک خالص فنی نثر کا نمونہ ملتا ہے، اس پر سجع اور بلاغت کی گرفت مضبوط ہے، یہ مختلف خطبوں اور دینی رسائل میں ملتی ہے، دوسرا رواں اور فطری نثر کا نمونہ ملتا ہے، سیاسی اور انتظامی امور سے متعلق تحریریں اسی دوسرے خانہ میں رکھی جا سکتی ہیں۔

عباسی دور کی ابتداء میں عربی نثر میں سادگی اور سلاست کی خوبی نظر آتی ہے، اس میں تصنع اور آورد نہ تھا، یہ اسلوب جاحظ کی تحریروں میں اپنے کمال کو پہونچا، اس میں فن کی دلآویزی ہے اور یہ لفظی صنائع و بدائع کی زنجیروں سے آزاد ہے، لیکن چوتھی صدی ہجری تک پہونچتے پہونچتے عربی نثر سجع اور قوافی کی زنجیروں سے گراں بار ہو گئی، ابن العمید اور قاضی الفاضل کی تحریریں اس کی آئینہ دار ہیں، یہ اسلوب لوگوں میں مقبول ہوتا رہا، اہل ادب اور نثر نگار عثمانی دور تک آنکھیں بند کر کے اسی راہ پر گامزن رہے، کچھ اہل قلم کے استثناء کے ساتھ یہی صدیوں تک وقت کا فیشن بنا رہا۔

انیسویں صدی کا آغاز ہوا تو عربی نثر ایک طرف لفظی صنعتوں کی پابندیوں میں الجھی ہوئی تھی،

دوسری طرف رکاکت بیان کا شکار تھی، عوامی بول چال کے بہت سے الفاظ جو اصل عربی کے الفاظ نہ تھے دائرۂ تحریر میں داخل ہونے لگے تھے۔

نثر کا یہی عمومی رنگ تھا، جب مصر میں پریس کے دور کا آغاز ہوا اور "الوقائع المصرية" کے نام سے پہلا صحیفہ شائع ہوا، اس صحیفہ کی زبان وہی ہے جو اس عہد کی زبان تھی، یعنی صنائع و بدائع کی پابندی، سجع اور قافیہ کا استعمال، فکر آرائی سے زیادہ پُر تصنع عبارت آرائی کی طرف توجہ، ژولیدگی زیادہ، اور سلاست کم، الوقائع المصریہ کی عبارت بطور مثال پیش ہے:

"الحمد لله باری الامم، والسّلام علی سيد العرب والعجم، امابعد
فان تحرير الامور الواقعة مع اجتماع بنی آدم المتدبجين فی
صحيفة هذا العالم ومن ائتلافهم وحركاتهم وسكونهم
ومعاملاتهم ومعاشراتهم التی حصلت من احتياج بعضهم
بعضًا هی نتيجة الانتباه والتبصر بالتدبير والاتقان واظهار
الغيرة العمومية سبب فعال منه يتطلعون علی كيفيّة
الحال والزمان۔

ترجمہ: "ساری تعریفیں خالق امم کے لیے اور صلاۃ و سلام سیّد العرب والعجم کے لیے، اما بعد، صحیفۂ عالم میں لکھنے والے بنی نوع انسان کے جمع ہونے کے ساتھ پیش آمدہ واقعات اور انسانوں کے باہمی تعلقات و معاملات اور حرکات و سکنات اور ضرورتوں کے باہمی انحصار کی وجہ سے پیدا ہونے والی معاشرت کو قید تحریر میں لانے کا رواج شروع ہوا اور یہ نتیجہ تھا تدبیر اور محکم طریقہ "کار کے ساتھ نظر، ہوشمند اور فکر ارجمند کو اختیار کرنے کا، اور عمومی غیرت کے اظہار کے جذبہ کا اور اس ذریعہ سے اہل زمانہ حال اور زمانہ کی کیفیت سے واقف ہوتے تھے۔"



عربی صحافت میں یہی اسلوب جاری رہا، لیکن یہ سلسلہ بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں مستقل طور پر ٹوٹ گیا، اگرچہ اس کے ٹوٹنے کے آثار بیسویں صدی کی ابتدا ہی میں نظر آنے لگے تھے، اب تحریر میں روانی اور سلاست پیدا ہونے لگی اور سجع کی پابندی بہت کم ہو گئی۔

سجع کی پابندی اور قافیہ کی رعایت انیسویں صدی کے ادبا کی تحریروں میں بہت زیادہ نظر آتی ہے، اس طرح کی تحریر کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو:

"وقد هاجت منهم الضراغم وطارت القشاعم وثارت
الغماغم وماجت الخضارم"

یعنی "شیر (شیر صفت انسان) بپھر اٹھے، بہادروں نے پھرتی سے حملہ کیا، گھوڑے غضبناک ہو گئے، اور سمندر موج زن ہو گئے"

اسی طرح ایک دوسرا نمونہ شیخ توصی کی تحریر سے لایا گیا ہے جو مصر کے لکھنے والے تھے، انھوں نے المقتطف کی تقریظ ان الفاظ میں لکھی:

"من سرح فی طروس المقتطف انسان الاحداق باقدام
الاهداب وسير فی نيسب صروح سطوره طرف الالباب،
وجده قلهرم علم يلفظ علی ساحل العقول جواهر الرقائق
ويغسل نقع الاوهام محيا الحقائق"

"جو شخص بنظر غائر المقتطف کا مطالعہ کرے گا اور قدم نگاہ کے ذریعہ اس کے صفحات کی وادیوں میں چلے گا، اور نگاہ عقل قلعہائے سطور پر ڈالے گا وہ محسوس کرے گا کہ ایک دریائے علم ہے جو ساحل عقل پر موتی لٹا رہا ہے، اور حقائق کی روشنی ہے جو وہم و گمان کے اندھیروں کو مٹا رہی ہے"

الشیخ اللیثی مصر کے مشہور ادیبوں میں ہیں، ان کی تحریر کا نمونہ یہ ہے:

"حمداً لمن اجری اودیة الآداب علی سنة اصحاب الاوذاق، واسری بقلوبهم من غیاهب لیل التقلید الی حضرات الاطلاق فلمحوا من خلال استار المبانی کل لطیفة، وسرحوا فی جمال ازهار المعانی بهمم شریفة، تتصرفوا فی اعنة الیراعة بکل مضمار وتشرفوا باسنة البراعة فی حلبة الفخار"۔

"تعریف اس ذات کے لیے ہے جس نے اصحاب ذوق کی زبانوں پر ادب وحکمت کا دریا رواں کیا اور ان کے دلوں کو تاریکی شبہائے تقلید سے نکال کر کھلی فضا کے نور میں لایا، پھر انھوں نے عمارتوں کے پردوں سے لطیف حقائق کا مشاہدہ کیا، اور انھوں نے بلند ہمتی سے گلدستۂ معانی کے جمال جہاں آرا سے اپنے ذوق نظر کو تسکین دی، پھر ہر میدان میں زمام خامہ کو متحرک کیا اور میدان عزت وناموری میں اپنی مہارت فن کے نیزے گاڑ دیے"۔

انیسویں صدی کے اواخر کے تمام اہل قلم کے یہاں کسی نہ کسی درجہ میں سجع اور صنائع کی رعایت ملتی ہے، شیخ محمد عبدہٗ، ابراہیم المویلحی، ادیب اسحاق، عبداللہ الندیم، یعقوب صنوع، ایسے لوگ عربی زبان کے ادیب تھے، صحافت سے اشتغال کی وجہ سے ان کے قلم میں روانی اور زور پیدا ہوا، اور عربی زبان وادب کے دائرے وسیع ہوئے، لیکن نثر پر شعری خصوصیات کا اثر باقی رہا، ان ادیبوں کے نمونے کتابوں میں موجود ہیں۔

بیسویں صدی کی ابتداء ہوئی تو عربی زبان کا اسلوب صحافت کے زیر سایہ تیزی کے ساتھ بدلنے لگا، اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انیسویں صدی کے اخبارات آخری چند برسوں سے پہلے ہفت روزہ تھے، لکھنے والوں کو اس کا موقع تھا کہ اپنی زبان وبیان کی نوک پلک درست کرتے،



صنعتوں کا خیال کرتے، عروس فن کی مشاطگی میں اپنا وقت لگاتے، بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ روزانہ اخبارات بھی زیادہ ہونے لگے، تحریر میں سرعت اور کثرت دونوں کی ضرورت پیش آنے لگی، زود نویسی اور بسیار نویسی کے ساتھ سہل نویسی بھی وقت کی ضرورت بن گئی، کیونکہ اخبارات بتدریج عوامی ہونے لگے، خواص کے ساتھ عوام کی طلب کو بھی پورا کرنے لگے، تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے اسلوب کے نمونے بیسویں صدی کے آغاز میں شیخ علی یوسف (المؤید کے ایڈیٹر) اور مصطفےٰ کامل (اللواء کے ایڈیٹر) اور احمد لطفی السیّد (الجریدہ کے ایڈیٹر) کے یہاں ملتے ہیں۔

المؤید عربی زبان کا پہلا روزنامہ اخبار ہے، المؤید کے ایڈیٹر شیخ علی یوسف نے نثر کی دنیا میں جو طرز نو ایجاد کی اس کے اثرات نصف صدی سے زیادہ مدت گذر جانے کے باوجود باقی ہیں، عربی نثر کم وبیش ان ہی خطوط پر گامزن ہے جو شیخ علی یوسف اور مصطفےٰ کامل، اور احمد لطفی السیّد نے بنائے تھے، اس لیے عربی نثر کی موجودہ سلاست، روانی اور شگفتہ بیانی عربی صحافت کی منت پذیر ہے، ان تینوں کو دور جدید کی عربی صحافت کا بانی قرار دیا جاسکتا ہے رفاعہ طحطاوی سے ادیب اسحاق اور عبداللہ الندیم تک عربی صحافت قدیم انداز نثر سے زیادہ آزاد نہ ہوسکی، لیکن جدید صحافت کی مجبوریوں نے زبان واسلوب میں ایک نئی روش پیدا کی اس روش میں وہ حسن تھا اور ابلاغ واظہار کی وہ آسانی تھی کہ عربی زبان کے ادیبوں نے اسی روش کو اپنالیا، اور اسی کی پیروی شروع کی۔

شیخ علی یوسف کی تحریر کا نمونہ پیش ہے:

ان الوطن لا یشتری بمال ولکنه شیئ یرثه الوطنی عن آبائه واجداده وهو ثمرة اجتهادهم وبذلهم النفس والنفیس

في سبيل بلادهم ومن ثم فنحن مدينون بالشكر لعمل اسلافنا
ولما كانوا قد مضوا من هذا العالم فلا نستطيع ان نبلغهم
شكرنا شخصيًا، وانما كل ما نقدر ان نفعله من هذا القبيل
وهو ان نعترف بفضلهم وهذا الاعتراف يكون بان نعنى بما
خلفوه لنا ونصونه من الاذى والسقوط، فاذا كنا نتمتع الآن
بالحرية والراحة من فضل اجتهاد رجالنا العظماء وسعيهم
وجب ان نحرص على تلك الحرية بمزيد الغيرة والاهتمام
حتى اذا جاءت الاجيال الاخرى من بعدنا اكرموا آثارنا واجلوا
تذكارنا كما نكرم نحن آثار اسلافنا ونجل تذكارهم"

"وطن کو کوئی مال و دولت کے عوض نہیں خرید سکتا ہے، بلکہ وطن کا باشندہ اس دولت کو اپنے آباء و اجداد سے میراث میں پاتا ہے، یہ آباء و اجداد کی محنت کا ثمر اور ان کی قربانیوں کا نتیجہ ہے، اور اسی لیے ہم اپنے اسلاف کے منت گذار ہیں اور چونکہ وہ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، اس لیے ہم شکر گذاری کو ان کے گوش تک نہیں پہونچا سکتے، جو کچھ ہم کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم ان کے فضل و کمال کا اعتراف کریں، اور اعتراف کا طریقہ یہ ہے کہ جو قیمتی ورثہ چھوڑ کر گئے ہیں وہ ہمارا مرکز توجہ بنے اور اسے ہم نقصان پہونچنے اور تلف ہونے سے بچائیں، اگر ہم اپنے اسلاف کی محنتوں کے نتیجہ میں آزادی اور آرام سے متمتع ہو رہے ہیں تو آزادی کی حفاظت غیرت و حمیت کے ساتھ ضروری ہے، تاکہ آیندہ آنے والی نسلیں ہماری احسان مند ہوں اور ہمیں اچھے نام سے یاد کریں، جس طرح اپنے اسلاف کو ہم اچھے نام سے یاد کرتے ہیں"



مذکورہ عبارت ۱۹۰۱ء کی ہے، اس وقت سے لے کر آج تک عربی نثر نگاروں کے اسلوب میں کوئی بڑا فرق رونما نہیں ہوا ہے، آج بھی وہی زبان کی سادگی ہے اور وہی سجع و قوافی کے تکلفات سے گریز ہے، اس صدی کی ابتداء میں یہی انداز بیان احمد لطفی السید کے یہاں ملتا ہے، احمد لطفی السید نے اپنی فکر انگیز تحریروں کے ذریعہ بیشمار ذہین افراد کو متاثر کیا، محمد حسین ہیکل، طٰہٰ حسین، مصطفٰی عبدالرزاق، عبدالقادر حمزہ، ابراہیم عبدالقادر المازنی، عباس محمود العقاد، عبدالرحمن شکری، توفیق دیاب سلامہ موسیٰ، منصور فہمی، اور محمود عزمی اور بیشمار اہل فکر و قلم احمد لطفی السید کے فکر و اسلوب کے خوشہ چین تھے۔

احمد لطفی السید کی تحریر کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"ان اول معنى للقومية المصرية تحديد الوطنية المصرية
والاحتفاظ بها والغيرة عليها غيرة التركي على وطنه والانجليزي
على قوميته لا ان نجعل انفسنا وبلادنا على المشاع وسط ما
يسمى بالجامعة الاسلامية تلك الجامعة التي يوسع بعضهم
معناها فيدخل فيه ان مصر وطن لكل مسلم"

"مصری قومیت کا اولین تقاضا یہ ہے کہ "وطنیت مصریہ" کو متعین کر دیا جائے پھر اس کی حفاظت کی جائے، اور اس کے بارے میں وہ غیرت ہونی چاہیے جو ترکی باشندہ کو اپنے وطن کے بارے میں اور ایک انگریز کو اپنی قومیت کے سلسلہ میں ہوتی ہے، ہمیں اپنے آپ کو اور اپنے ملک کو اتحاد اسلامی کے زیر اثر مشترک اور شاہراہ پر پڑی ہوئی شے نہیں بنانا چاہیے، اتحاد اسلامی کے مفہوم کو بعض لوگ اتنا وسیع کرتے ہیں کہ اس کے تحت مصر ہر مسلمان کا وطن قرار پاتا ہے۔"

یہ تحریر ۱۹۰۹ء کی ہے، یہ نہ صرف احمد لطفی السید کے اسلوب کا نمونہ ہے بلکہ ان کی فکر کا بھی نمونہ ہے، لطفی السید پان اسلام ازم کے مخالف اور مصری قومیت کے علم بردار تھے۔

مصطفےٰ کامل کی ایک تقریر کا اقتباس ملاحظہ کیجیے، یہ تقریر اسکندریہ میں کی گئی تھی۔

" سادتی وابناء وطنی الاعزاء !

ما اقتربت من مدینتکم الزاهرة حتی شعرت من نفسی بارتیاح زائد وانشراح خاص لانی عهدها واعهدها مدینة الحیاة الحقیقة ومهد الرجال المشهورین بالشجاعة والبسالة و الاقدام والمقابلة الودیة التی قوبلت بها من کرمائها و ساداتها قبل ان اقف بینکم اللیلة خطیباً زادتنی حبالها و میلاً لاهلها وانی احمل کل ذلك الاكرام من اهل الاسکندریة علی عظیم رغبتهم فی اعزاز مبدأ الوطنیة الشریف لا علی اکرام شخصی الضعیف.

ویسرنی ان احادثکم الیوم فی شئون الوطن العزیز هذا الوطن الذی تحبونه حبا مفرطاً وتعملون لخیره وسعادته وارانی موفقا لحصولی علی هذه الفرصة الثمینة التی اتبادل معکم فیها ما یختلج فی نفوسنا من الامال والامانی التی هی معنی الحیاة والباعث القوی علی العمل بجد ونشاط.

وقد اتخذتم یا ابناء الاسکندریة فی کل بلاد مصر مثالاً للهمة والحماسة فلتکونوا کذلك مثالاً صادقاً للدعة



والسکون والاعتدال لتصبحوا وتمسوا اساتذة لمصر کلها فی تأدیة الواجب نحو الوطن المحبوب"

" حضرات اور برادران وطن عزیز !

میں آپ کے پُر رونق اور خوبصورت شہر کے قریب آیا تو مسرت اور انشراح کی کیفیت مجھ پر طاری ہوئی، یہ شہر تاریخ کی ان شخصیتوں کا گہوارہ ہے جن کے نام کے ساتھ بہادری، بلند ہمتی اور حوصلہ مندی کی روایات وابستہ ہیں، اور اس اسٹیج پر آنے سے پہلے میرے ساتھ اس شہر کے اعیان وخواص نے جس محبت و خلوص کا معاملہ کیا ہے، اس سے اس شہر اور باشندگان شہر کے لیے میری محبت دوچند ہو چکی ہے، باشندگان اسکندریہ نے میرے ساتھ اکرام واعزاز کا جو معاملہ کیا ہے اس کا سرچشمہ میری ذات سے تعلق سے کہیں زیادہ وہ تعلق ہے جو ان کو اپنے وطن عزیز سے ہے۔

میرے لیے مسرت کی بات ہے کہ میں آپ کے سامنے وطن عزیز سے متعلق باتیں کہوں، اس وطن کی باتیں جس سے آپ کو بے انتہا محبت ہے، اور جس کی خیر خواہی اور ترقی کے لیے آپ کوشاں ہیں، ملاقات کے اس قیمتی موقع سے فائدہ اٹھا کر میں ان تمناؤں اور آرزوؤں کا ذکر کروں گا جنھوں نے ہم سب کے دلوں میں بسیرا کر رکھا ہے، اور جن سے زندگی قائم ہے اور کارگاہِ حیات میں جن کی وجہ سے حرکت ونشاط موجود ہے۔

اے باشندگان اسکندریہ! آپ سب نے پورے ملک میں ہمت اور جذبہ کی مثال قائم کردی ہے، آپ سکون واعتدال اور نرمی کی مثال بھی قائم کریں، آپ صبح وشام وطن محبوب کے لیے اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں مصر کے استاذ اور مربی کا رول ادا کریں۔"

مصطفےٰ کامل بلند پایہ صحافی اور ادیب اور اعلیٰ درجہ کے خطیب تھے، مذکورہ اقتباس ان کی خطابت و ادب کے ساتھ ان کے فکر کا بھی نمونہ ہے، مصطفیٰ کامل مصر کی جنگ آزادی کے بہت بڑے لیڈر تھے، ان کی قومیت اور وطن پرستی کی جھلک اس اقتباس میں ملتی ہے۔

عربی صحافت نے عربی زبان کے اسلوب کو جو نیا رخ دیا ہے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے مصر کے مشہور ادیب اور مصنف طٰہٰ حسین نے لکھا ہے:

" ان ارباب الصحافة هم الذين شبوها وهم الذين عملوا بواسطة صحافتهم على تفكيك الاغلال الفنية القديمة ..... ان الكثرة المطلقة من الذين يقرأون الصحف والكتب حريصون على شيئين، الاول ان يقدم اليها نثر فصيح مستقيم اللفظ نقي الاسلوب بريئ من الابتذال، حر من اغلال البديع والبيان، والثاني ان يكون هذا النثر على ما قدمنا ملائما لذوقها الجديد وميولها الجديدة قيما في معناه كما هو قيم في لفظه حر في معناه كما هو حر في لفظه ايضا۔"

" صحافیوں کا گروہ ہی وہ گروہ ہے جس نے جدید عربی نثر کو پروان چڑھایا، اور صحافت کے ذریعہ فن کی قدیم بیڑیاں کاٹ دیں..... اخبارات اور کتابوں کی پڑھنے والی عظیم اکثریت دو چیزوں کی خواہشمند ہے، ایک تو یہ کہ ایسی فصیح اور صحیح نثر اس کے سامنے آئے جو الفاظ کے اعتبار سے مستقیم اور اسلوب کے اعتبار سے شگفتہ ہو جس میں رکاکت نہ ہو اور جو بدیع و بیان کی فنی پابندیوں سے آزاد ہو، اور دوسرے یہ کہ یہ نثر





جدید ذوق اور رجحانات کی آئینہ دار ہو، جو معنوی اور لفظی دونوں اعتبار سے باوزن ہو اور معنوی اور لفظی دونوں اعتبار سے پابندیوں سے آزاد ہو۔"

طٰہٰ حسین جو دور جدید میں عربی زبان کے مسلم ادیب اور ناقد تھے اور خود بھی ایک رسالہ کے ایڈیٹر اور مختلف رسالوں کے مقالہ نگار رہے، عربی زبان کے اسلوب کے سلسلہ میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ اسے آسان اور سلیس ہونا چاہیے، موجودہ عربی نثر کی سلاست کو صحافیوں کا احسان قرار دیتے ہیں۔

عربی نثر کے ارتقاء اور اس پر صحافت کے اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے عباس محمود عقاد قلم طراز ہیں:

" سجع محفوظ الفواصل والقوافي يتردد على كل قلم ويزج في كل موضوع ثم ارتقى الى سجع يبتكر الكاتب فيه كثيرا او قليلا من الفاظه وقوافيه ثم انطلق في اسلوب منمق مصقول لا تقوم فيه الاسجاع والقوالب ثم تعددت الاساليب والموضوعات فكثرت اساليب الادباء والصحافيين ووضح اثر الحرية في الكتابة۔"

عقاد نے مندرجۂ بالا عبارت میں یہ بات کہی کہ عربی نثر بتدریج فواصل، قوافی اور سجع سے آزاد ہوئی، پھر اس کے بعد قوافی سے آزاد ہوئی، اس کے بعد پر شکوہ اور مزین نثر کا دور آیا، پھر صحافیوں اور ادیبوں نے اسے زیادہ فطری اور آسان بنا دیا، اور عربی انشاء پر پابندی سے زیادہ آزادی کے اثرات نمایاں ہوئے۔

بیسویں صدی میں پہلی جنگ عظیم سے پہلے عربی صحافت فواصل و قوافی سے آزاد ہونے کے باوجود زبان و بیان کے اعتبار سے مفخم اور پر شکوہ تھی، اس لیے یہ زبان قوم کے ہر طبقہ تک

ابلاغ و ترسیل کے کام میں یک گونہ رکاوٹ بن رہی تھی، لیکن ۱۹۲۵ء کے بعد مفخم اور پُرجلال طرزادا کا دور بھی ختم ہوگیا، اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ۱۹۲۵ء کے بعد اخبارات زیادہ تر خبروں اور رپورٹوں کا مجموعہ بن گئے، جب کہ پہلے اخبارات جو جنگ عظیم اول سے پہلے شائع ہوتے تھے، مضامین اور تبصروں کا مجموعہ ہوتے تھے یا مضامین کے حصہ کی اخبار پر زیادہ چھاپ ہوتی تھی، صحافت کے اخباری اور سیاسی ہونے کی وجہ سے یا بالفاظ دیگر زیادہ عوامی ہوجانے کی وجہ سے زبان آسان سے آسان تر ہوگئی۔

"آخر ساعۃ" کے ایڈیٹر محمد التابعی کو اس نئے طرز تحریر کا بانی کہا جاسکتا ہے، یہ ہفت روزہ ۱۹۳۴ء سے نکلنا شروع ہوا۔ محمد التابعی اس ہفت روزہ کے ادیب بھی ہلکی پھلکی زبان میں لکھتے تھے، گفتگو اور تحریر کے درمیان فرق ختم ہوگیا، محمد التابعی آخر ساعۃ کے ایڈیٹر ہونے سے پہلے روز الیوسف کے اصل محرر تھے، صرف نام سیدہ روز الیوسف کا ایڈیٹر کی حیثیت سے تھا، بلکہ روز الیوسف میں مختلف جلسوں اور اجتماعات یا شخصیات کے بارہ میں رپورتاژ یا تاثرات محمد التابعی لکھتے تھے، ان کی آسان اور دلچسپ تحریریں بہت مقبول ہوئیں، پھر اسی آسان روزمرہ کی گفتگو کی زبان میں انھوں نے سیاسی تبصرے بھی لکھنے شروع کیے، یہ سیاسی تبصرے پڑھنے والوں کے درمیان مقبول ہوئے، اور عوام اور سیاست کے درمیان رشتہ زیادہ مستحکم ہوگیا، اس نئے انداز کے سیاسی مضامین کے لیے "الخبر المقالی" یا "المقالۃ الخبریۃ" کی اصطلاح عربی میں رائج ہوئی، اس انداز تحریر کے رواج پانے کی وجہ سے بالکل سادہ اور آسان صحافتی نثر کا پھیلاؤ شروع ہوا، اور لکھنے والے اسی اسلوب میں مضامین لکھنے لگے، اور عام طور سے تصنیف و تالیف کی زبان بھی اسی اسلوب سے قریب ہوگئی، اس دور کے معاصر صحافیوں کی ایسی ہی زبان ہے، مصطفےٰ امین، علی امین، احسان عبدالقدوس، محمد حسنین ہیکل، احمد بہاء الدین، کامل مروہ،



سعید فریحہ اور رشدی المعلوف اور دیگر صحافی اسی زبان میں لکھتے ہیں۔

عربی نثر پر صحافت کے اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے الشیخ عبداللہ العلایلی لکھتے ہیں:

"کانت الصحافة عاملاً اصيلاً فی انزال الاسلوب العربی من ارستقراطيته وابراجه العاجية كما اضفت عليه صفة التطويع بحيث يتناول المعطيات الحضارية عامة ثم كل ما يتفتق عنه الذهن البشری، ففضلها فی هذه الناحية غير منكور"

"صحافت وہ اصل عامل ہے جس نے عربی زبان کے اسلوب کو ارسٹوکریسی کے مقام سے اور ہاتھی دانت کے پرشکوہ برج سے نیچے اتارا اور اس کو سازگاری کی صلاحیت عطا کی تاکہ وہ تہذیب و تمدن کی برکتوں کو سمیٹ سکے اور انسانی ذہن کے ہر زاویۂ فکر کو بیان کرسکے، صحافت کے اس احسان سے عربی نثر سبکدوش نہیں ہوسکتی"۔

جدید صحافتی نثر دراصل عامی زبان اور ادبی زبان کے درمیان کی چیز ہے، لیکن چونکہ اس زبان کے ذریعہ عوام سے زیادہ رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے، اس لیے زیادہ تر مصنفین اور اہل قلم نے بھی اسی زبان کو ذریعۂ ابلاغ بنایا اور اس طرح اس زبان کو بڑے پیمانہ پر فروغ ہوا اور یہ زبان آٹوکریسی کے دور سے نکل کر ڈیموکریسی کے دور میں داخل ہوئی، اور جدید ایجادات اور جدید مغربی تعبیرات کو بیان کرنے کے لائق ہوئی۔

جدید مقالہ نگاری جدید صحافت کی دین ہے، صحافت کے دور سے پہلے عام طور سے کتابیں لکھی جاتی تھیں، یا رسائل لکھے جاتے تھے، مقالہ کے مقابلہ میں ان کا حجم بھی زیادہ ہوتا تھا، اور مواد اور اسلوب کے اعتبار سے بھی ان میں زیادہ جامعیت اور پختگی ہوتی تھی۔

مقالہ صحافت کی دین ہے، وہ صحافت جس کا تعلق پریس سے ہے، اور جو یورپ میں شروع ہوئی۔ مقالہ نگاری کی ابتدا بھی یورپ میں ہوئی، اور جب جدید صحافت سے عربی زبان آشنا ہوئی تو مقالہ کا فن بھی عربی زبان میں آیا، اس طرح جدید عربی مقالہ نگاری اور اس کا اسلوب عربی صحافت کے ذریعہ وجود میں آیا۔

نثر میں مقالہ نگاری کے فن کے علاوہ صحافت کے ذریعہ جس فن کا ارتقاء ہوا وہ افسانہ اور ناول کا فن ہے، اخبارات کے صفحات میں پہلی بار مغربی افسانوں اور کہانیوں کے ترجمے شائع ہوئے، ۱۸۶۱ء میں وادی النیل کے نام سے ایک اخبار مصر سے شائع ہونا شروع ہوا، اس میں عبداللہ ابو السعود نے ایک اطالوی کہانی کا ترجمہ شائع کیا، اس کے بعد روضۃ الاخبار میں کئی فرانسیسی افسانوں کے ترجمے شایع ہوئے، اس کے بعد نزہۃ الافکار میں محمد عثمان جلال نے کئی فرانسیسی کہانیوں کے ترجمے چھاپے، اسی طرح انیسویں صدی میں ادیب اسحاق نے "مصر" اور "التجارۃ" اور دوسرے اخبارات میں کئی فرانسیسی ناولوں کے ترجمے شایع کیے، ہفت روزہ اخبارات کے علاوہ جو ادبی مجلّے شایع ہوتے ان میں بھی مغربی ادب کا تعارف ہوتا، کسی افسانہ کا ترجمہ شایع ہوتا، مغربی ناول کے ترجمے قسط وار شایع ہوتے تھے، یعقوب صروف کا المقتطف اور جرجی زیدان کا الہلال انگریزی اور فرانسیسی شعر و ادب کے ترجمے مسلسل پیش کرتا۔

مغربی افسانوں اور ناولوں کے ترجمے شایع کرنے اور اس کے نہج پر طبعزاد افسانے لکھنے کی کاوشوں کو فروغ دینے کے لیے اس صدی کی ابتداء میں مصر اور لبنان سے کئی رسالے نکلے، بیروت سے دیوان الفکاہۃ، النفائس، الراوی شایع ہوئے، قاہرہ سے منتخبات الروایات، سلسلۃ الروایات، الروایات الشہیرۃ، مسامرات الندیم، مسامرات الشعب اور الروایات الکبری، اور دوسرے کئی رسالے نکلے، اسکندریہ سے السمیر نکلا، عربی زبان میں پہلے کلیلہ ودمنہ، الف لیلۃ اور سندباد اور دوسری داستانیں موجود تھیں، لیکن جدید افسانہ اور ناول مغربی ادب کی دین ہے، اور عربی زبان میں جدید افسانہ اور ناول کا آغاز صحافت کے ذریعہ ہوا۔



محمد مویلحی کی مشہور کتاب حدیث عیسیٰ بن ہشام قسط وار مصباح الشرق میں شایع ہوتی رہی مصباح الشرق ۱۸۹۸ء میں ابراہیم المویلحی نے نکالنا شروع کیا، یہ المویلحی الکبیر کہلاتے تھے، انکے لڑکے محمد مویلحی جو خود ادیب اور قصہ نگار تھے، ان کے معاون تھے، اور یہ المویلحی الصغیر کہے جاتے تھے، حدیث عیسیٰ ابن ہشام کے بعد محمد حسین ہیکل کے قلم سے "زینب" کے نام سے ناول نکلا، یہ ناول جسے جدید عربی ادب کا پہلا ناول کہا جاتا ہے، ۱۹۱۴ء میں احمد لطفی السید کے اخبار "الجریدہ" میں قسط وار شائع ہوتا رہا، محمد مویلحی کی کتاب حدیث عیسیٰ ابن ہشام کی مقبولیت دیکھ کر مشہور شاعر حافظ ابراہیم نے لیالی سطیح کے نام سے ایک ناول لکھا، یہ تینوں ناول جدید عربی ادب میں بہتر و بلند تر ناول نگاری کا حسن آغاز سمجھے جاتے ہیں۔

عربی صحافت کے سر نہ صرف عربی نثر کی ترقی اور وسعت کا سہرا ہے، بلکہ مقالہ نگاری اور فن قصہ گوئی کی ایجاد کا بھی سہرا ہے، سعید البستانی، جرجی زیدان، نقولا حداد اور یعقوب صروف نے بکثرت مغربی افسانوں اور ناول کے ترجمے کیے، اور طبعزاد افسانے اور ناول لکھے، اور اس طرح عربی زبان جدید افسانہ اور ناول سے آشنا ہوئی۔

**ادبی صحافت۔ رسائل و مجلات** انیسویں صدی کا نصف آخر اور بیسویں صدی کا ربع اول وہ عہد ہے جس میں ادب اور صحافت کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے، صحافت کی زمام مصر اور عالم عربی میں ان لوگوں کے ہاتھ میں رہی جو عربی زبان کے بہترین انشاء پرداز تھے، اس وقت صحافی کا مطلب ہی یہ ہوتا تھا کہ وہ اچھا نثر نگار ہے، چنانچہ بیشتر صحافی پہلی جنگ عظیم سے پہلے عربی زبان کے بہترین ادیب بھی تھے، وہ اپنی نثر میں مختلف صنعتوں کا لحاظ اور سجع کی ایک گونہ پابندی

کرتے تھے، رفاعہ رافع الطہطاوی، احمد فارس الشدیاق، پطرس البستانی، یعقوب بن صنوع، محمد عبدہ، خلیل سرکیس، یعقوب صروف، ابراہیم مویلحی آل نقلا، ادیب اسحاق، نجیب حداد، عبداللہ الندیم، ابراہیم الیازجی، علی یوسف، لطفی السید، مصطفےٰ کامل، جرجی زیدان، یہ سب کے سب صحافی بھی تھے اور ادیب بھی، غرضیکہ اس پورے عہد کی صحافت پر ادیب کا سکہ چلتا تھا، خبروں سے زیادہ تبصروں کو اہمیت حاصل تھی، علمی اور ادبی مضامین سے اخبارات و رسائل کے صفحات بھرے رہتے تھے،

لیکن آہستہ آہستہ صحافت کے ارتقاء کے ساتھ صحافی کے لیے زود نویسی اور بسیار نویسی بھی لازم ہوتی گئی، اور اس طرح بتدریج ادبی صحافت عام صحافت سے الگ ہوگئی، عام صحافت ادب سے زیادہ سیاست سے وابستہ ہوگئی، جس میں مقالات سے زیادہ خبروں اور رپورٹوں کو اہمیت حاصل تھی۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان کا زمانہ عربی ادبی صحافت کے ارتقاء کا زمانہ ہے، اس دور میں خالص ادبی مجلّے وجود میں آئے، مصر سے "الراوی" نکلا، جس میں افسانے شایع ہوتے تھے، جدید افسانہ درحقیقت صحافت کی دین ہے، کیونکہ پہلی مرتبہ مغربی افسانوں کے ترجمے عربی زبان میں اخبارات کے ذریعہ لوگوں تک پہونچے، پھر عرب ادیبوں نے اس نہج پر طبع آزمائی کی، اور طبع زاد افسانے لکھے، اس عہد میں مصر سے "اپولو" کے نام سے بھی ادبی رسالہ نکلنا شروع ہوا، جو شاعری کے لیے اور شاعری پر تنقیدی مضامین کے لیے خاص تھا، دوسری جنگ عظیم کے بعد عالم عربی کے افق پر الہلال، الادیب، المختار، الثقافۃ، الرسالہ، الکاتب المصری اور المقتطف جیسے علمی اور ادبی رسالے نظر آتے ہیں۔

اخباری صحافت اور ادبی صحافت کی دو الگ تقسیمیں صحافت کے ارتقاء کے ساتھ ناگزیر تھیں،



پریس کے دور نے جب ہر چیز مطبوعہ شکل میں ہر خاص و عام کے دروازہ تک پہونچا دی تو اخبار عوامی ذوق کی چیز بن گیا، اخبارات صنعت کے دائرہ میں آگئے، اخبارات میں عمومی ذوق کی تسکین کا سامان زیادہ مہیا کیا جانے لگا، اب ادبی رسائل خواص کے ذوق کی تسکین کے لیے نکلتے تھے، اور طلب و رسد کے قانون اقتصاد سے آزاد تھے۔

ادبی رسائل نے ادبی اور شعری ذوق کی تربیت میں بڑا اہم رول ادا کیا، ادبی رسائل کے صفحات نثری و شعری کاوشوں کی نمائش گاہ بھی ہوتے تھے، اور ادبی مناقشوں کی رزم گاہ بھی، ڈاکٹر محمد حسین ہیکل کے اخبار "السیاسۃ الاسبوعیۃ" میں قدیم و جدید کی بحث میں بہت سے ارباب دانش بینش نے حصہ لیا، "الرسالۃ" کے صفحات پر مصطفےٰ صادق الرافعی اور عباس محمود عقاد کے درمیان اور پھر طٰہٰ حسین اور عقاد کے درمیان ادبی مباحثے ہوئے، لبنان سے شایع ہونے والے "المکشوف" اور "الادیب" میں ادبی معرکہ آرائیاں ہوئیں، الغرض ادبی رسالوں نے ادبی دلچسپیوں اور مفید بحثوں میں جاذبیت پیدا کی، اور ادب کی رونق بڑھادی، انشاء پردازی اور قلم آرائی کے ذوق کو عام کیا، اور زبان و ادب کے گنج گراں مایہ کو منفعت عام کے لیے ارزاں کردیا۔

**مصر سے شائع ہونے والے مشہور ادبی رسائل**

(۱) المقتطف: عرب دنیا کا سب سے قدیم ادبی مجلہ ہے، ابتداءً یہ بیروت سے ۱۸۷۶ء میں شایع ہوا، اس کے ایڈیٹر مشہور ادیب یعقوب صروف اور فارس نمر تھے، دونوں بیروت کی امریکن یونیورسٹی سے فارغ تھے، جب ۱۸۸۴ء میں بیروت میں سنسرشپ کا قانون نافذ ہوا تو پھر یعقوب صروف اور فارس نمر نے ۱۸۸۵ء میں اس مجلہ کو قاہرہ سے نکالا، اس رسالہ میں بلند پایہ معروف اہل قلم کے مضامین شایع ہوتے، بہت سے لوگوں نے المقتطف میں مضمون نگاری کے ذریعہ شہرت عام حاصل کی، عرب دنیا کے تمام اہل ذوق کے گھروں میں یہ پرچہ ذوق و شوق کے ساتھ پڑھا جاتا تھا، ۱۹۵۲ء تک

یہ رسالہ نکلتا رہا ، المقتطف میں ادبی اور تنقیدی موضوعات پر عربی زبان کے بہترین اہل قلم کے مضامین شایع ہوتے تھے ، محب الدین خطیب کے الزہراء کی طرح یہ بھی صف اول کا ادبی رسالہ تھا جس میں بیشتر خالص علمی اور تحقیقی مضامین ہوتے تھے ، ایک شمارہ کے عنوانات یہ ہیں :

(۱) ابو العلاء المعری ۔ (۲) حدیث عیسیٰ ابن ہشام ۔ (۳) الشعر المنثور (نثری شاعری) ۔ (۴) التعلیم فی مصر (مصر میں تعلیم) ۔ (۵) الحکمۃ فی الغزل (غزل میں حکمت و دانش کی باتیں) ، (۶) التحقیق لابن الجوزی (ابن جوزی کی تحقیقات)

(۲) **الهلال** : مشہور ادبی اور معلوماتی ماہنامہ "الہلال" ۱۸۹۲ء میں جرجی زیدان کی ادارت میں قاہرہ سے نکلنا شروع ہوا ، اس ادبی رسالہ کی عمر بھی قاہرہ کے مشہور اخبار "الاہرام" کی طرح طویل ہے ، ۱۹۶۲ء تک یہ رسالہ نکلتا رہا ، ۱۹۱۴ء میں جرجی زیدان کا انتقال ہو گیا ، ان کے انتقال کے بعد الہلال کے ایڈیٹر ان کے صاحبزادے امیل زیدان ہوئے ، لیکن الہلال کی شہرت جرجی زیدان کی وجہ سے ہوئی جو لبنانی ادیب اور مورخ تھے ، انھوں نے عربی زبان میں پہلی بار تاریخی ناول بھی لکھے ، یہ تاریخی ناول زبان کی چاشنی کی وجہ سے آج بھی مقبول ہیں ، ان کی مشہور کتاب تاریخ التمدن الاسلامی ہے جو پانچ ضخیم جلدوں میں ہے ، ان کی دوسری مشہور کتاب تاریخ الآداب العربیۃ ہے جو چار ضخیم جلدوں میں ہے ، جرجی زیدان نے مصر میں دار الطباعۃ والنشر بھی قائم کیا ، جو عالم عربی کا مشہور طباعتی ادارہ ہے ۔

الہلال صرف مصر نہیں بلکہ دنیا میں ہر جگہ عربی زبان کے اصحاب ذوق کے درمیان مقبول رسالہ رہا ہے ، ادبی ، تاریخی اور سماجی موضوعات پر اس میں مضامین شائع ہوتے تھے ، افسانے بھی شائع ہوتے تھے ، جرجی زیدان کے کئی ناول اس میں قسط وار شائع ہوئے ، یہ المقتطف کی طرح خالص علمی اور تحقیقی رسالہ نہ تھا ، چھیاسٹھ ۶۶ صفحے کے اس رسالہ میں حسب ذیل عنوانات کے



تحت مضامین ہوتے تھے :

(۱) مقالات : مشہور اہل قلم کے مضامین علمی و تاریخی و ادبی موضوعات پر (۲) السؤال والاقتراح : قارئین کے سوالات کے مفصل جوابات ۔ (۳) عجائب المخلوقات : باتصویر معلوماتی مضمون ، کسی پرندے یا درخت وغیرہ کے بارے میں ۔ (۴) العائلۃ والمنزل : تدبیر منزل ، یا امور خانہ داری سے متعلق مضمون ۔ (۵) اخبار علمیۃ صناعیۃ : جدید علمی ایجادات و انکشافات کے بارے میں مضمون ۔ (۶) اخبار اجتماعیۃ وثقافیۃ : سماجی اور معاشی عام موضوعات پر مضامین ، (۷) خواطر و آراء : مشاہیر مفکرین کے خیالات کا نچوڑ (۸) تاریخ الشہر : ایک ماہ کے درمیان پیش آنے والے اہم واقعات ۔ (۹) مطبوعات جدیدۃ : کتابوں پر تبصرے ۔ (۱۰) روایۃ تاریخیۃ : قسط وار تاریخی ناول ۔

۱۹۰۹ء کے الہلال میں مندرجہ بالا عنوانات ملتے ہیں ۔

(۳) **الزهراء** : مصر سے شائع ہونے والا مشہور ادبی رسالہ ہے ، المقتطف کی طرح اس میں تحقیقی ادبی مضامین شائع ہوتے تھے ، لیکن المقتطف کے برعکس اس میں دینی مضامین بھی شائع ہوتے تھے ، لیکن یہ دینی مضامین بھی تحقیقی اور معیاری ہوتے تھے ، الزہراء قاہرہ سے ماہانہ نکلتا تھا ، مشہور اہل قلم محب الدین الخطیب اس کے ایڈیٹر تھے ۔

اس کے سرورق پر یہ عبارت ملتی ہے جس سے رسالہ کی نوعیت کا اندازہ ہو جاتا ہے :

الزهراء

مجلة علمية ادبية اجتماعية شهرية تعنى بوجه خاص بالابحاث

العربية والإسلامية والشرقية

لمنشئها :

محب الدين الخطيب

۱۹۳۵ء کے ایک شمارہ کے کچھ مضامین کی سرخیاں ملاحظہ ہوں :

(۱) آثار بیروت، (بیروت کے آثار قدیمہ)۔ (۲) الاتجاهات فی الادب العربی الیوم (آج کل کے عربی ادب میں جدید رجحانات) (۳) التجدید والاصلاح (تجدید و اصلاح)۔ (۴) تفاسیر القرآن المشہورۃ، (قرآن کی مشہور تفسیریں)۔ (۵) خزانۃ کتب بانکی پور (بانکی پور پٹنہ کی لائبریری) (۶) خزانۃ کتب رام پور (رام پور کا کتب خانہ)۔ (۷) ابن خلدون (ابن خلدون)۔ (۸) خطط الشام لکرد علی (کرد علی کی خطط الشام)۔

(۴) **المنار** :۔ یہ مصر کا مشہور علمی اور دینی پندرہ روزہ رسالہ ہے جو شیخ محمد عبدہٗ کے شاگرد سید رشید رضا کی ادارت میں ۱۸۹۸ء سے لے کر ۱۹۳۵ء تک شائع ہوتا رہا اس کے سرورق پر یہ عبارت ملتی ہے :

المنار

مجلة علمية ادبية تهذيبية مليّة اخباريّة

(تصدر فی غرّة کل شهر عربی وفی السّادس عشر منه۔)

لمنشئها

السید محمد رشید رضا۔

یہ رسالہ دینی اور فکری نوعیت کا تھا، خالص ادبی مضامین بھی شائع ہوتے تھے، لیکن کم شائع ہوتے تھے، یہ خوبصورت ٹائپ پر شائع ہوتا تھا، ایک صفحہ پر جہاں مضمون ختم ہو جاتا ہے وہیں سے دوسرا مضمون نئی سرخی کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے، یعنی نئے مضمون کے لیے نئے صفحہ کا التزام نہ تھا، شیخ محمد عبدہٗ کی تفسیر قسط وار شائع ہوتی تھی، ہر شمارہ میں آثار علمیّہ و ادبیّہ کے عنوان کے تحت اہم کتابوں کا تعارف پیش کیا جاتا تھا، صفحات کے نمبر ایک جلد یعنی ایک سال کے ہوتے تھے،



۱۹۰۹ء کے دو شماروں کے اہم مضامین کے عنوانات ذیل میں درج ہیں :

(۱) ابن تیمیہؒ (۲) الاجماع علی بطلان التقلید (تقلید کے باطل ہونے پر اجماع) (۳) زواج المسلم بغیر المسلمة (مسلمان کی شادی غیر مسلم عورت سے) (۴) التفسیر بالرای (تفسیر بالرائے)۔ (۵) النسخ فی القرآن (قرآن میں ناسخ اور منسوخ)، (۶) المرتد وقتله (اسلام میں مرتد کی سزا) (۷) المرأة المسلمة (مسلمان عورت) (۸) جمعیۃ ندوۃ العلماء فی الہند (ہندوستان کی انجمن ندوۃ العلماء)۔

رشید رضا کے مضامین ہر شمارہ میں شائع ہوتے تھے، ان کے علاوہ معروف رصافی حافظ ابراہیم، کامل پاشا، توفیق صدقی اور دیگر اچھے لکھنے والوں کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

(۵) **الضیاء** :۔ عالم عربی کا قدیم ادبی ماہنامہ ہے، قاہرہ سے ۱۸۹۷ء میں نکلنا شروع ہوا، اور ۱۹۰۶ء تک نکلتا رہا، اس میں لغوی مباحث پر مقالات شائع ہوتے، مشہور لکھنے والوں کی زبان کی غلطیاں پکڑی جاتیں، انگریزی اور فرانسیسی الفاظ کے صحیح عربی ترجمے پیش کیے جاتے اور ترجمہ کے فن پر علمی بحثیں شائع ہوتی تھیں۔

(۶) **السیاسة الاسبوعیة** :۔ اس کے ایڈیٹر محمد حسین ہیکل تھے، یہ اخبار ۱۹۲۶ء سے نکلنا شروع ہوا، طٰہٰ حسین عقاد اور مازنی جیسے مشہور لکھنے والوں کے مضامین اس میں شائع ہوتے،

(۷) **البیان** :۔ شیخ نجیب حداد کی ادارت میں ۱۹۲۲ء میں نکلا۔

(۸) **البلاغ الاسبوعی** :۔ مشہور صحافی عبدالقادر حمزہ اس کے ایڈیٹر تھے، یہ بھی ۱۹۲۶ء سے نکلنا شروع ہوا۔

(۹) **الفصول** :۔ محمد زکی عبدالقادر اس کے ایڈیٹر تھے۔

(۱۰) **اپولو** :۔ مشہور ادیب و شاعر احمد زکی ابوشادی اس کے ایڈیٹر تھے، یہ رسالہ صرف شاعری کے لیے خاص تھا۔

(۱۱) **الرسالة** :۔ اس کے ایڈیٹر احمد حسن زیات تھے، یہ رسالہ ۱۹۳۳ء سے نکلنا شروع ہوا اور ۱۹۵۲ء تک نکلتا رہا، الرسالہ ادبی حلقوں کا مقبول رسالہ تھا، اس میں قدیم اور جدید کی آمیزش اور مشرق و مغرب کے دھاروں کا سنگم تھا، مغربی ادب سے اکتساب اور قدیم عربی ادب سے استفادہ کی دعوت دی جاتی، اس رسالہ کا پروگرام بلکہ موٹوگرام اس کے ایڈیٹر کے الفاظ میں یہ تھا:

"ربط القديم بالحديث ووصل الشرق بالغرب"

یعنی قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کی آمیزش

الرسالة کا ایک ضمیمہ الگ سے "الرواية" کے نام سے نکلنا شروع ہوا، جو صرف افسانوں اور کہانیوں کے لیے خاص تھا، لیکن زیادہ دنوں تک یہ رسالہ نہیں نکل سکا، احمد حسن زیات کے مضامین کا مجموعہ بعد میں وحی الرسالہ کے نام سے شائع ہوا۔

(۱۲) **الشباب** :۔ اس کے ایڈیٹر محمد عزمی تھے، ۱۹۳۶ء سے یہ ہفت روزہ نکلنا شروع ہوا، اس میں ادبی مضامین کے ساتھ سیاسی مضامین بھی شائع ہوتے تھے، السياسة الاسبوعيه اور البلاغ الاسبوعی کے بند ہو جانے کے بعد یہ بہترین ادبی ہفت روزہ تھا، اور گویا ان دونوں کا قائم مقام اور جانشین تھا، لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے تھوڑے عرصہ تک نکل کر بند ہو گیا۔

(۱۳) **منبر الشرق** :۔ اس کے ایڈیٹر علی الغایاتی تھے، ۱۹۳۸ء سے جینوا سے نکلنا شروع ہوا، اس کے ایڈیٹر مصری ادیب تھے۔

(۱۴) **الثقافة** :۔ یہ معروف ادبی اور علمی رسالہ ۱۹۳۹ء سے قاہرہ سے نکلنا شروع ہوا، مشہور مورخ اور ادیب احمد امین اس کے ایڈیٹر تھے، مصر کے مشہور علمی ادارہ جمعیۃ التالیف والترجمہ والنشر کے ارکان اور مصری یونیورسٹی (الجامعة المصرية) کے اساتذہ اس رسالہ میں مضامین لکھتے، ان کے علاوہ عرب دنیا کے مشہور اہل قلم کے مقالات اس میں شائع ہوتے، اس رسالہ کا شمار



عالم عرب کے چند بہترین علمی رسالوں میں کیا جاتا ہے، ۱۹۵۳ء میں یہ رسالہ بند ہو گیا، احمد امین کے مضامین کا مجموعہ فیض الخاطر کے نام سے دس جلدوں میں شائع ہوا۔

(۱۵) **المختار** :۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد مصر سے شائع ہونے والا پہلا عربی میگزین ہے، یہ دراصل ریڈرز ڈائجسٹ کا عربی ایڈیشن ہے، جسے ریڈرز ڈائجسٹ کے ادارہ نے نکالا تھا، اور فواد صروف کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا تھا، یہ عربی ڈائجسٹ ابھی تک شائع ہو رہا ہے۔

(۱۶) **الكاتب المصري** :۔ یہ رسالہ بھی دوسری جنگ عظیم کے بعد شائع ہوا، اس کے مدیر شہیر ڈاکٹر طٰہٰ حسین تھے، الجامعة المصرية کے اساتذہ اس رسالہ میں اپنی نگارشات شائع کراتے تھے، طٰہٰ حسین کی اعلیٰ تعلیم جامعۂ ازہر کے بعد جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں فرانس میں ہوئی تھی، اس لیے مصر کے وہ ادبا جنھوں نے فرانسیسی مکتب علم و فکر سے خوشہ چینی کی تھی اس رسالہ میں پابندی سے لکھتے تھے، اس رسالہ میں زیادہ تر ادبی اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے تھے، طٰہٰ حسین چونکہ خود طبع آزاد اور فکر آزاد رکھتے تھے، اور اسی انداز فکر کے داعی اور نقیب تھے، اس لیے اس کی چھاپ رسالہ پر تھی، فرانسیسی ثقافت سے ان کو حصہ وافر ملا تھا، اور ساتھ ہی ساتھ اسلامی صحافت سے بے خبر نہ تھے، "الكاتب المصري" میں ان کے مضامین ان کے فکر کے آئینہ دار ہوتے، ان کی کہانیوں کا مجموعہ "المعذبون في الارض" قسط وار اسی رسالہ میں شائع ہوا، ۱۹۴۸ء میں یہ رسالہ بند ہو گیا۔

(۱۷) **اخبار اليوم** :۔ ۱۹۴۶ء میں نکلنا شروع ہوا، مصطفےٰ امین اور علی امین دو بھائی تھے جو اس کے ایڈیٹر تھے، اخبار کے سائز پر ۱۲ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا، مصر سے شائع ہونے والے بہترین ہفت روزہ اخبارات میں اس کا شمار تھا، طٰہٰ حسین، عقاد اور توفیق الحکیم کے مضامین اور افسانے اس میں شائع ہوتے تھے،

توفیق الحکیم کے ڈرامے، یوسف جوہر اور احمد الصاوی محمد کے افسانے اور ابراہیم المازنی کے تنقیدی مقالات بھی اس میں شایع ہوتے، اس کی مقبولیت دیکھ کر دوسرے ہفت روزہ رسالوں نے بھی تنقیدی مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔

(۱۸) الکتاب:۔ ۱۹۴۶ء میں یہ مشہور علمی و ادبی ماہنامہ مشہور علمی ادارہ دار المعارف کا ترجمان تھا اور قاہرہ سے شائع ہوتا تھا، عادل الغضبان اس کے ایڈیٹر تھے لیکن یہ ۱۹۵۱ء میں بند ہوگیا۔

(۱۹) علم النفس:۔ ۱۹۴۵ء میں قاہرہ سے ڈاکٹر ابو مدین الشافعی کی ادارت میں یہ بلند پایہ رسالہ نکلا، اس میں علم نفسیات پر زیادہ تر مضامین شایع ہوتے تھے، ۱۹۵۳ء میں بند ہوگیا۔

(۲۰) المستقبل:۔ ۱۹۴۷ء میں یہ ادبی ماہنامہ نکلنا شروع ہوا، اس کے ایڈیٹر اسمٰعیل مظہر تھے

(۲۱) العالم العربي:۔ ۱۹۴۷ء میں قاہرہ سے یہ ادبی اور سیاسی مجلہ نکلنا شروع ہوا۔

(۲۲) الرسالة الجديدة:۔ ۱۹۵۲ء کے انقلاب کے بعد یہ پہلا ادبی رسالہ تھا جو نکلنا شروع ہوا

(۲۳) کتابی:۔ ۱۹۵۴ء میں نکلا، حلمی مراد اس کے ایڈیٹر تھے۔

(۲۴) المجلة:۔ ۱۹۵۶ء میں شایع ہوا، علی الراعی اس کے ایڈیٹر تھے۔

(۲۵) الادب، (۲۶) الشهر، (۲۷) أضواء:۔ یہ تینوں رسالے چند مہینوں کے لیے ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۷ء کے درمیان نکلے۔

۱۹۵۷ء کے بعد چند برسوں تک ادبی رسالے مصر سے نہیں نکلے اور لبنان ادبی صحافت کا مرکز رہا، اس کا فائدہ یہ ہوا کہ عام اخبارات نے جو حقیقۃً خبروں کا مجموعہ ہوا کرتے تھے ہفتہ میں ایک یا دو بار ادب و شعر اور افسانہ و تنقید کے لیے صفحات مخصوص کیے، عربی اخبارات کے ادبی کالموں کی نگرانی صحافتی عملہ کے بجائے ادیبوں کے سپرد ہوتی تھی آج بھی روزنامہ الشعب کے ادبی صفحہ کی نگرانی عبدالرحمٰن الشرقاوی اور روزنامہ الجمہوریہ کے ادبی صفحہ کے انچارج موجودہ دور کے ایک شاعر محمد الفیتوری ہیں، روزنامہ الاخبار کے ادبی صفحہ کے نگران انیس منصور ہیں اور روزنامہ الاہرام کی ادبی صفحہ کی ذمہ دار عائشہ بنت الشاطی ہیں۔

---



# مطبوعات جدیدہ

**تذکرہ دیار حبیب صلی اللہ علیہ وسلم (جلد اول)** — مترجمہ مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۵۲ مجلد، قیمت ۱۰/- روپے، پتہ دار الارشاد، مدنی روڈ، اٹک شہر، پاکستان۔

مسلمانوں کے نزدیک مکہ معظمہ کی طرح مدینہ منورہ بھی بڑی متبرک و محترم جگہ ہے، علمائے اسلام نے اس کے خصوصیات و فضائل پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، ان کتابوں میں علامہ ابوالحسن نور الدین سمہودی مصری (متوفی سنہ ۹۱۱ھ) کی تصنیف وفاء الوفا کو بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، اس میں مدینہ منورہ کی تاریخ، فضیلت اور واقعات و مقامات وغیرہ کا ذکر ہے، مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے، اصل عربی کتاب دو جلدوں میں آٹھ ابواب پر مشتمل ہے، زیر نظر کتاب صرف پہلی جلد کے تین مکمل اور چوتھے باب کے جزوی حصہ کا ترجمہ ہے، پہلے باب میں مدینہ منورہ کے اور دوسرے متعدد ناموں کا ذکر ہے، دوسرا باب تیرہ فصلوں کا مجموعہ اور مدینہ طیبہ کے فضائل و خصوصیات کے ذکر پر مشتمل ہے، اس میں دوسری بستیوں پر اس کی فضیلت دکھائی ہے اور یہ بتایا ہے کہ مدینہ میں اقامت اختیار کرنا افضل ہے، پھر مدینہ کے حرم ہونے اور اس میں گناہوں کے ارتکاب اور اہل مدینہ کے ساتھ بدسلوکی کی سزا وغیرہ کا ذکر ہے، تیسرے باب میں مدینہ منورہ میں آباد قوموں اور قبیلوں کا تذکرہ ہے، اس میں پہلے طوفان نوحؑ کے بعد کی مدینہ میں آبادی کا کچھ حال دیا ہے، پھر یہود کے آباد ہونے کی تفصیل لکھی ہے اور انصار کے قبائل اوس و خزرج کے حالات، ان کی آبادی کے مقامات اور بعض باہمی جنگوں وغیرہ کا بیان تحریر کیا ہے اس کے بعد ان کے مشرف بہ اسلام ہونے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت اور مدینہ میں داخلہ کے واقعات کی تفصیل ہے اور آخر میں مدینہ میں آپؐ کے قیام کے زمانہ کے سال بسال واقعات درج ہیں، اس سلسلہ میں غزوات و سرایا کا ذکر

…یادہ نمایاں ہے چوتھے باب کی تین فصلوں میں پہلے مسجد نبوی کی تعمیر کا حال بیان کیا ہے، پھر اس کے رقبہ میں
…وسیع و اضافہ اور آپؐ کے امامت فرمانے کی جگہ وغیرہ کا ذکر ہے، مترجم نے کہیں کہیں کتاب کے مباحث کی
…وضیح بھی کی ہے، مگر اس کتاب کو جدید انداز میں تحقیق اور ایڈٹ کرکے اور غیر ضروری مباحث کو حذف کرکے
…فید حواشی و تعلیقات کے ساتھ شائع کرنا چاہئے تھا تاکہ اردو خواں طبقہ کو اس سے استفادہ میں سہولت ہوتی،
…صنف نے اس میں فضائل و مناقب کی عام کتابوں کی طرح ضعیف اقوال و روایات نقل کرنے سے
…ہیز نہیں کیا ہے، اور بعض نہایت دور از کار توجیہات پیش کی ہیں، کھینچ تان کر مدینہ طیبہ کے چورانوے[۹۴] نام
…ئے ہیں، اس سلسلہ میں بعض آیات و احادیث سے غلط استدلال و استنباط بھی کیا ہے اور مرجوح تفسیری
…ال بھی نقل کئے ہیں، اقوال و توجیہات کی کثرت بھی قاری کو الجھاؤ میں ڈال دیتی ہے، غالباً اسی بنا پر خود
…صنف نے اس کا خلاصہ بھی کیا تھا، جو چھپ گیا ہے، مترجم نے مصنف اور تصنیف کے بارے میں
…فصل معلومات اور ضروری حالات بھی تحریر نہیں کئے ہیں، ترجمہ میں سلاست، روانی اور شگفتگی کی
…بھی ہے، یہ کہیں تو عربیت سے گرانبار ہے جیسے "جو نماز متوجہا الی الکعبہ ادا فرمائی ہے"۔ (صفحہ ۴۲)
…رجل من الانصار سے یہ روایات نقل کرنے۔۔۔" (صفحہ ۴۲۶) "اس غربی حجرہ کی طرف ہی (صفحہ ۴۳۰)
…نماز روضۃ من ریاض الجنۃ سے آگے۔۔۔" (صفحہ ۴۳۰) اور کہیں لفظوں، جملوں اور عبارت میں
…ہمواری ہے"، مثلاً "جو مسلمان مدینہ منورہ میں اقامت پذیر ہو، اور اس شہر کی مادی تکالیف
…بر کرے" (صفحہ ۵۹) "کیونکہ اب مدینہ منورہ میں ضروریات زندگی ناقابل برداشت
…حد تک گراں ہو چکی ہیں، اور اس کے اہل و عیال بھی زیادہ ہیں" (صفحہ ۵۹)
…ذکیر و تانیث اور زبان کی بھی غلطیاں ہیں، جیسے "کڑک کا آواز تھا، (صفحہ ۱۶۰)
"اس علاقہ کی سارا بستیاں" (صفحہ ۱۹۱) "اس کو اللہ تعالیٰ اس طرح
…ل دے گا جس طرح نمک پانی میں گل جاتا ہے" (صفحہ ۶۶) وغیرہ

"ض"

جلد ۱۴۰ ماہ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۸۷ء عدد ۶

## مضامین



## مقالات



## اعلان

دار المصنفین شبلی اکیڈمی کی مطبوعات کی قیمتوں میں جنوری ۱۹۸۸ء سے کاغذ، کتابت، وطباعت کی بڑھتی ہوئی گرانی کے پیش نظر کسی قدر اضافہ کیا گیا ہے، امید ہے کہ قدر دان اس اضافہ کو گوارا فرمائیں گے۔

"منیجر"